قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۵ ——— اپریل ۱۹۹۲ء ——— شمارہ ۴

بدلِ اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: ۱۰/- روپے

فہرست مضامین

لمعات		۲
لیلۃ القدر	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۸
عید	ثریا عندلیب	۱۳
اسوۂ حسنہ	قندِ مکرّر	۱۷
تصوّف جمہوریت اور سوشلزم	علی محمد چدھڑ	۲۳
ہمارا معاشرہ	طلعت محمود	۴۰
عقیدہ ایصالِ ثواب	سعید احمد واصف	۴۳
خود بدلتے نہیں بدل دیتے ہیں قرآں کو۔	ضیاء اللہ	۴۸
اقبال اور اصولِ اجتہاد	ثریا عندلیب	۵۲
یہ کس کا پاکستان ہے	راستی توصیف	۵۸
بچّوں کا صفحہ	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۶۰
درسِ قرآن	ادارہ	۶۳
مطبوعاتِ طلوعِ اسلام ٹرسٹ	اشتہار	۶۶
ضرورت مترجمین	اشتہار	۶۸
رابطۂ باہمی	ادارہ	۶۹
ہم اور اسلام	خان افضل آفریدی	۷۰
خط بنام وفاقی شرعی عدالت (انگریزی)	ڈاکٹر سید عبدالودود	۷۷
بابا گرونانک (انگریزی)	محمد لطیف چوہدری	۸۰

لمعات

قانون کی حکمرانی

آپ نے کبھی کوئی پتھر بلندی سے لڑھکتا دیکھا ہے، جوں جوں وہ نیچے آتا ہے اس کی رفتار بڑھتی ہی چلی جاتی ہے،

یہی حال تنزل کی طرف رُخ کر چکی سوسائٹی اور ملک کا ہوتا ہے، ہر کوئی اس کی گراوٹ کی بڑھتی ہوئی رفتار دیکھ کر لرز جاتا ہے، چونک اُٹھتا ہے، ہمارے ملک کی بھی یہی حالت ہے، زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے کے لہجے میں یہی تشویش جھلکتی نظر آتی ہے۔

کوئی کہتا ہے سیاست میں جو گراوٹ اب آئی ہے پہلے کہاں تھی، گو سیاست پہلے بھی اونچے طبقے کی اجارہ داری تھی مگر اس وقت اس میں نامی گرامی خاندانی لوگ ہوتے تھے، یہ نو دولتیئے، جرائم پیشہ لوگ کب ان ایوانوں میں راہ پاتے تھے، ــــ کوئی کہتا ہے بیوروکریسی اس حد تک کرپٹ ہو چکی ہے کہ کوئی کام بھی تو رشوت اور سفارش کے بغیر نہیں ہو سکتا، عام سے عام، سادہ سے سادہ معمول کے کام کے لئے بھی کاغذوں کے نیچے پہیے لگانے پڑتے ہیں۔

انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، کسٹم، پولیس کے محکموں کے متعلق شکایات تو ایک زمانے سے چلی آ رہی ہیں اور اب معمول کا حصّہ بن چکی ہیں۔ ان محکموں کی برائیوں کی بارے میں آپ جتنا بھی مبالغہ آمیز قصّہ سنائیں لوگ جھٹ یقین کر لیں گے۔

اب تو ڈاک اور تار، ٹیلی فون اور ریل کے محکمے بھی ملامت کی اس دوڑ میں شامل ہو چکے ہیں۔

تعلیم کے میدان کے کسی پرانے شخص سے بات کریں تو وہ تعلیم کے موجودہ معیار اور طالب علموں کے نئے رجحانات سے نالاں نظر آئے گا ــــ کوئی سلیبس کا رونا روتا ہے، کوئی استادوں سے بیزار، استاد سے بات کرو تو وہ شاگردوں کے ہاتھوں پریشان ہے ــــ نقل اتنی عام ہے کہ ممتحن بے بس نظر آتے ہیں۔

لوگ پولیس سے ہی نہیں عدالتوں اور نظامِ عدل کے ہاتھوں بھی پریشان ہیں۔

پریشان تو لوگ ہسپتالوں اور ڈاکٹروں کے رویّے سے بھی ہیں، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری ہی کچھ کم آفتیں نہ تھیں کہ ملاوٹ نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے ــــ

اور ان میں تازہ ترین آفت کا اضافہ منشیات اور ان کا بڑھتا ہوا استعمال ہے۔

یہ بات بھی نہیں کہ کسی نے ادھر دھیان نہیں دیا یا اصلاحِ احوال کی کوشش نہیں کی، بارہا کوششیں کی گئیں، برائیوں کو ختم کرنے کے لئے کمیشن بنائے گئے، کمیٹیاں تشکیل دی گئیں، قانون بنائے گئے، نئے نئے محکمے وجود میں آئے، لوگوں نے کرپشن پہ شور مچایا تو سرکار نے اینٹی کرپشن کا محکمہ بنا دیا جس کا فرض کرپشن کو ختم کرنا تھا مگر ہوا یہ کہ کرپشن اور بڑھ گئی اس لئے کہ الزام دینے والوں کے بقول ایک اور ساجھے دار پیدا ہو گیا۔

محکمے از خود اصلاحی اقدامات سے معذور و مجبور نظر آنے لگے تو ان پہ ایک نیا احتسابی ادارہ ــــ وفاقی محتسب کی صورت میں بنا دیا گیا ــــ مگر روائتی سُرخ فیتے سے باہر تو کوئی بھی نہ نکل سکا' اس کی بھی اپنی حدود اور پابندیاں ہیں' اور پھر ایک وفاقی محتسب اور بیسیوں حکومتی ادارے' وزارتیں اور محکمے ــــ یک انار صد بیمار والی بات ہے' وفاقی محتسب بھی حالات اور واقعات کو دیکھ کر کہہ اٹھتا ہوگا۔ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔

ایک سہانی صبح اخباروں پہ نظر پڑتی ہے' ایسی خبر چھپتی ہے کہ سبھی چونک اٹھتے ہیں' ہر جگہ اس کا ذکر ہوتا ہے' کالم چند دن اسی سے بھرے رہتے ہیں ــــ پھر آہستہ آہستہ خبر ختم ہو جاتی ہے اور وہی بات جو پہلے اتنی اہم لگتی ہے آہستہ آہستہ بے وقعت ہو کر معدوم ہو جاتی ہے ــــ

ہائی کورٹوں کے جج صاحبان از خود کسی بات کا نوٹس لیتے ہیں اور انتظامیہ کو پابند کر دیتے ہیں کہ معاملے کو ان کے روبرو پیش کیا جائے مگر ہوتا یہی ہے کہ جن محکموں کے خلاف وہ بات جاتی ہے اسی کے اہل کار اپنی رپورٹیں لے کر پیش ہوتے ہیں' جُرم کے معاملے میں پولیس ہی کیس تیار کرتی ہے اور زمین کے معاملے میں پٹواری' اس کے رجسٹر اور نقشے ہی حرفِ آخر ہوتے ہیں۔

پھر کیا اس کا کوئی حل نہیں، کیا یہ مسئلہ لاینحل ہے، کیا ہم ہار مان کر بیٹھ جائیں اور انتظار کرتے رہیں کسی مسیحا کا' وہ آئے اور معجزہ دکھائے اور مسائل حل کر دے ــــ

یا پھر جب خلفشار حد کو پہنچے تو کوئی خونیں انقلاب آئے اور اس نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دے' ایسے میں ہوتا کیا ہے؟ بطور ردِّ عمل' محروم طبقے اُٹھتے ہیں اور موجود نظام کو تہس نہس کر دیتے ہیں' اوپر کے طبقوں اور ان کی حمایت میں آنے والی تمام مزاحم قوتوں کو بزور ختم کر دیتے ہیں اور بس! یہ محض ایک فساد ہوتا ہے انقلاب نہیں' انقلاب تو قلب کی تبدیلی، خیالات کی پاکیزگی اور سیرت کی پختگی کا نام ہے۔ سیرت و کردار کی یہ تبدیلی ایسے انسان سامنے لاتی ہے جو تاریخ کا دھارا تک بدل کر نئی دنیا وجود میں لاتے ہیں اور ایسی تبدیلیوں کا باعث بنتے ہیں جو عام حالات

میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ لوگ معاشرے سے فساد، اونچ نیچ کو دُور کرکے ایک نئے معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں ـــــ انبیا علیہم السلام کے تربیت یافتہ ساتھیوں کے ہاتھوں لائی تبدیلیاں اس کی مثال ہیں ـــــ

یہ بات تو طے ہے کہ سیرت وکردار کی یہ تعمیر تعلیم کے بغیر ممکن نہیں اور زمانہ گواہ ہے کہ ہم نے آزادی کے یہ چوالیس سال اس معاملے میں مجرمانہ غفلت میں گزارے ہیں، تعلیم پر کوئی توجہ ہی نہیں دی گئی، ہم شب و روز اس بات کا تو چرچا کرتے رہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر، اسلام نافذ کرنے کے لئے حاصل کیا گیا ہے، پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے ـــــ اور کون نہیں جانتا کہ نظریاتی مملکت میں اس نظریئے کو سامنے رکھ کر زندگی کے تمام شعبوں کی پلاننگ کی جاتی ہے، ایک نظریاتی مملکت کی سیاست، معیشت اور سب سے بڑھ کر تعلیم اس نظریے کی حامل اور مظہر ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں اور شعبوں کی طرح تعلیم میں بھی اس سے لاتعلقی اور بے اعتنائی برتی گئی، بغیر کسی ہدف، بغیر کسی منزل اور سمت کے تعین کے اسے پھیلنے دیا گیا، گلی گلی، محلہ محلہ انگلش میڈیم سکول تو کھل گئے مگر مقصد خالصتاً کاروباری رہا۔ جگہ جگہ سکول کھلنے کے باوجود چالیس سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود شرح خواندگی وہیں کی وہیں رہی بلکہ پہلے سے بھی کم ہوگئی، اس سے ثابت یہ ہوا کہ زرگری کا یہ سلسلہ محض چند بڑے شہروں میں سرکاری درس گاہوں سے بالائی کو منتقل کرنے کے لئے قائم کیا گیا ـــــ سرکاری درس گاہیں ان کے لئے رہ گئیں جو غیر سرکاری سکولوں کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے اور سرکاری درس گاہوں کے ملازمین نے جواب دہی کے عمل کے نہ ہونے کے سبب شاگردوں کی تعلیم سے رہی سہی توجہ بھی ہٹالی، معیار تعلیم دن بدن گرتا گیا ـــــ اب جو بھی شخص اپنے بچوں کو صحیح تعلیم دلوانا چاہتا ہے وہ اپنے گھر کے بہت سے اخراجات کم کرکے یا پسِ پشت ڈال کر، تنگی ترشی برداشت کرکے، محاورۃً پیٹ کاٹ کر پرائیویٹ سکولوں کا رُخ کرتا ہے اور جب بچہ گھر آکر ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل سٹار اور بابا بلیک شیپ سُناتا ہے تو خوش ہوتا ہے کہ اس کی محنت اور پیسہ کام آیا۔

سیرت وکردار کی تعمیر جو تعلیم کی روح اور تربیت کا مقصدِ اولیٰ ہے، اس کی طرف توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، اس کا نتیجہ ڈگری یافتہ جہلا کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہے۔

یہ معاشرہ جس کو خاص اقدار کا حامل ہونا تھا آج اقدار کے فقدان کا شکار ہے۔

ہمارے رہنما حضرات کہتے نہیں تھکتے کہ قرآنِ پاک ہمارا منشور ہے، ہمارا ضابطۂ قانون ہے، ہمارا راہنما ہے مگر اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا کہ قرآن جو نظامِ زندگی دیتا ہے وہ خاص اقدار پر استوار ہوتا ہے۔

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۶۵/۴)

(اللہ نے ہر شے کے لئے پیمانے مقرر کردئے ہیں)

اللہ تعالیٰ کلامِ پاک میں انسانوں کو سمجھانے کی غرض سے بار بار قوانینِ فطرت کی طرف توجہ دلاتا ہے، بتاتا ہے کہ خارجی کائنات کا سارا نظام، ان عظیم کروں کی گردش، چاند سورج کا نکلنا اور غروب ہونا، دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن، یہ سلسلہ اس لئے اس باقاعدگی اور حسن و خوبی سے جاری ہے کہ وہ خدا کے قانون کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے، عظیم سے عظیم کرہ بھی اپنے مدار، دئیے ہوئے رستے سے سرِمو انحراف نہیں کر سکتا —— انسانوں سے کہا گیا ہے کہ تم اس میں کبھی تبدیلی نہ پاؤ گے، کائناتی نظام کا اس حُسن و خوبی سے چلنا صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ خدا کے دئیے ہوئے قانون اور راہنمائی کے مطابق عمل پیرا ہے —— یہی حال تمام دوسری مخلوقات کا ہے۔ انسان ہی وہ واحد مخلوق ہے جسے اختیار و ارادہ دیا گیا ہے، چاہے تو خدا کی دی ہوئی راہنمائی، وحیٔ خداوندی، قرآنِ پاک پہ ایمان لائے چاہے نہ لائے، اس کے مطابق عمل کرے، نہ کرے، اس پہ کوئی جبر نہیں، وحیٔ خداوندی اس کی راہنمائی تو کرتی ہے اسے مجبور اور پابند نہیں کرتی، اگر وہ اس کی راہنمائی پر عمل کرے تو اس کی زندگی خوشگوار ہو سکتی ہے، نہ کرے گا تو محرومیاں، ناآسودگیاں، خوف اور حزن اس کا مقدر ہوں گے یہاں اس دنیا میں بھی اور اُخروی زندگی میں بھی ——

کائناتی قانون کی طرح انسان کی راہنمائی کے لئے جو ضابطہ حیات دیا گیا ہے وہ بھی ایسے قوانین و اقدار کا حامل ہے کہ اس پہ عمل کیا جائے تو یقیناً وہی نتائج پیدا کرے گا جن کی یہ نشاندہی کرتا ہے کیونکہ اس کی ضمانت کائنات کے پیدا کرنے والے نے دی ہے ——

اس نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ قانون کبھی تبدیل نہیں ہوتے۔

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۝ (۴۸/۲۳)

اللہ اپنے قوانین کبھی تبدیل نہیں کرتا۔

اس لئے کامل یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان پر عمل کرنے کے نتائج بھی وہی ہوں گے —— اور ہمیشہ ویسے ہی ہوں گے —— قانون کہتے ہی اس بات کو ہیں کہ اگر ایسا کرو گے تو یہ نتیجہ نکلے گا اور ایسا کرنے کا ہمیشہ یہی نتیجہ ہو گا۔

ہمارا المیہ یہی ہے کہ یہاں قانون پہ یقین ختم ہو گیا اور —— آدم بمیرد از بے یقینی، تنزل کی طرف گامزن معاشرے میں غلط اقدار نے سب کچھ گڈمڈ کر دیا ہے، قانون کی عملداری کا تصور ہی ختم ہو گیا ہے —— اور اب تو نوبت یہاں تک آن پہنچی ہے کہ طالب علم محنت کرتا ہے تو اسے یقین نہیں ہوتا کہ امتحان میں اس کا نتیجہ اس کی محنت کے مطابق ہو گا، اسے شک ہوتا ہے کہ کوئی اور نقل کے ذریعے، رشوت اور سفارش کے ذریعے اس کی محنتوں پہ پانی پھیر دے گا اور اس کی محنتوں کا ثمر اُچک کر لے جائے گا۔

ملازمت کے امیدوار کو درخواست گزارنے کے بعد اکثر و بیشتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ درخواستیں توخانہ پُری کے لئے مانگی جاتی ہیں، کوالی فیکیشن، قابلیت چُنے جانے کا معیار نہیں، جسے ملازم رکھا جانا ہے وہ تو سفارش کے بل پہ پہلے ہی چُنا جا چکا ہے۔

عدالت میں پیش ہونے والے مظلوم کو معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ اس کے حق میں ہونے کا امکان نہیں کیونکہ اس کے پاس کوئی سفارش نہیں، وسائل نہیں ظالم بااثر ہیں، مالدار ہیں، ارکانِ حکومت کے قریب تر ہیں ـــــ وہ اللہ کے حضور گڑگڑاتا ہے، اونچے ایوانوں تک پہنچنے کے وسائل تو نہیں ہوتے، بزرگانِ مذہب کے مزاروں کا رُخ کرتا ہے، منتیں مانتا ہے، پیرانِ طریقت کے درباروں میں حاضری دیتا ہے، یہاں بھی نذرانہ گذارتا ہے، دعاؤں کی درخواستیں کرتا ہے ـــــ

ہمارے ہاں یہ جو پیری مریدی بڑھ رہی ہے، مزار پرستی کا رجحان ترقی پر ہے اس کی ایک وجہ (علاوہ تعلیم کی کمی کے) یہی ہے کہ یہاں قانون کی بالادستی کا تصور مٹ چکا ہے ـــــ اور ڈوبتا انسان تو تنکے کا سہارا بھی ڈھونڈتا ہے اور غنیمت جانتا ہے ـــــ خاص طور پر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہر صاحبِ اقتدار ان پیرانِ کرام کی قدم بوسی کرتا ہے، مزاروں پہ ہاتھ باندھ کر کھڑا نظر آتا ہے، چادریں چڑھاتا اور اُلٹے پاؤں لوٹتا ہے ـــــ اُسے کیا معلوم کہ ان میں سے کتنے دلی عقیدت سے حاضری دیتے ہیں اور کتنے سیاسی دکھاوے کے لئے اِدھر کا رُخ کرتے ہیں، کتنے اپنے جذبوں کی تسکین کے لئے آتے ہیں، کتنے لوگوں کے جذبات سے کھیلنے کے لئے۔

ـــــ اور پھر جب عام آدمی محنتِ شاقہ کے بعد محرومی اور نیم فاقہ کشی کے عذاب میں مبتلا پیشانی سے پسینہ پونچھ کر آسمان کی طرف نظریں اٹھاتا ہے تو اُسے بے شمار فلک بوس عمارتیں نظر آتی ہیں، وسیع و عریض باغات والے سنگِ مرمر سے سجے محلات نظر آتے ہیں جن میں وہ لوگ رہ رہے ہوتے ہیں جو اس جیسے انسانوں کے استحصال کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتے، وہ فریاد کرتا ہے۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تنگ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

ـــــ اور افلاک سے اس کے نالوں کا کوئی جواب نہیں آتا، ایسے میں اس کا ایمان ڈول جائے، اس کے پاؤں ڈگمگا جائیں تو آپ اسے کس حد تک موردِ الزام گردانیں گے ـــــ

بات طویل ہوتی جا رہی ہے، قصہ مختصر کرتے ہوئے یہی کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر اس کے کہ حالات فساد کی طرف لے جائیں اور چشمِ فلک یہ نظارہ دیکھے کہ

غلام گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر قبائے خواجہ کہ رنگین زخونِ ما بود است

لازم ہے پٹڑی سے اُتری ہوئی اس گاڑی کو دوبارہ قانون کی پٹڑی پر چڑھا دیا جائے تاکہ یہ اس منزل کی طرف جو اس کے لئے متعین کر دی جائے ایک بامعنی اور توازن بدوش سفر جاری رکھ سکے ـــــ!

چلتے چلتے...

(اے آر خاں، شیفلڈ۔ انگلستان)

نااہل اولاد کے لئے چھوڑا ہوا ترکہ بعض اوقات اولاد کے لئے وجۂ مخاصمت بن جاتا ہے۔ ہم غلامی کے متکنڈوں میں جکڑے ہوئے تھے کہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی مومنانہ فراست نے یک لخت پاکستان کے نام سے ہمیں ایک مملکت کا وارث بنا دیا ـــــ!

پیشہ ور گداگروں کو گھر گرہستی کی ذمّہ داریاں سونپتے ہوئے قائد نے نہ ان کا شجرۂ نسب دیکھا اور نہ ہی ان کی صدیوں پرانی غلامانہ ذہنیت کو پیشِ نظر رکھا ـــــ نتیجہ ظاہر ہے۔

مانگ کر کھانے والے گھر میں کھائیں یا مسجد کے حجرے میں بیٹھ کر یہی سمجھتے ہیں کہ

"ہے یہ مشک آمیز افیون ہم غلاموں کے لئے
ساحرِ انگلیش مارا خواجۂ دیگر تراش"

نصف صدی انتظار کر کے دم توڑ گئی۔ مذہبی پیشوائیت کے بہتّر فرقے قرآن و سنّت کے شامیانے تلے، ملّتِ پاکستانیہ کے لئے اسلامی قوانین کی تدوین میں شب و روز مصروف رہے لیکن ہمارے عزیز دوست ریاض احمد رمق کے بقول ؎

تقلید کے اندھے غاروں میں تاویل کی راہیں ڈھونڈتے ہیں
یوں نورِ سحر پا جائے رمق یہ عقل کے بس کی بات نہیں

(قندِ مکرر)

علامہ غلام احمد پرویزؒ

لیلۃ القدر

دنیا کی کسی قوم کو لیجئے۔ سال میں کچھ دن ایسے آئیں گے جن میں وہ جشن و مسرّت کے تیوہار منائیں گی۔ جب دنیا میں مسلمان آئے تو ان کے ذمّے عدل و انصاف کے پھیلانے اور جور و استبداد کے مٹانے کیلئے ایسے اہم فرائض عائد کئے گئے کہ انہیں فرصت ہی نہ تھی کہ وہ اس قسم کے مسرّت و شادمانی کے جشن منائیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی داستانِ زندگی میں بعض واقعات ایسے تھے جن کی یاد قائم رکھنا اقوامِ عالم کی موت و حیات کے اصولوں کی یاد تازہ کرنا تھا۔ یہ اس ملّت کے تیوہار ہیں اور ان تیوہاروں میں سب سے نورانی وہ، جس کا مطلع ہلالِ رمضان اور مقطع روزِ عید ہے۔ جس عظیم الشّان واقعہ کی یاد میں یہ تیوہار منایا جاتا ہے۔ اس کی عظمت و رفعت خود بتادے گی کہ اس تیوہار کو کتنا اہم ہونا چاہیئے۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی رشد و ہدایت کیلئے مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں اپنے رسول بھیجے جو لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچاتے رہے۔ لیکن خدا کے یہ پیغامات اپنی اصلی شکل میں کہیں محفوظ نہ رہ سکے۔ کہیں یہ زمانے کے انقلابات کے ہاتھوں مٹ گئے اور کہیں خود انسانوں نے اپنے ہاتھوں سے ان کی صورت مسخ کردی۔ اب ذرا تصوّر میں لائیے ایسے منظر کو کہ نگاہیں ذوقِ نظارہ سے بیتاب لیکن دنیا سے روشنی گم ہوجائے۔ زندگی کا مدار صاف ہوا پر ہو، لیکن فضا مہلک جراثیم سے بھرپور ہوجائے۔ جہاں ناتواں پیاس کی شدّت سے تڑپ رہی ہو، لیکن پانی کے ہر چشمے میں زہر مل چکا ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اگر یکایک سورج بے نقاب ہوکر سامنے آجائے۔ اس مہلک فضا کی جگہ بادِ نسیم کے خوشگوار جھونکے نزہت و لطافت کی ہزار جنّتیں اپنے جلو میں لئے ایک نئی زندگی کا سامان پیدا کردیں۔ ان زہر سے بھرے ہوئے چشموں کی جگہ ایک جوئے رواں مچلتی لوٹتی مسکراتی دامنِ کہسار سے تازہ ولولوں کی بشارتیں لئے بڑھتی چلی آئے۔ تو فرمائیے کیا یہ واقعہ ایسا نہیں ہوگا کہ اس کی یاد اس وقت تک قائم رکھی جائے جب تک دنیا میں زندگی کے قیام و بقا کیلئے نفیس روشنی، لطیف ہوا اور صاف پانی کی ضرورت ہے؟ یہ آفتابِ جہانتاب، یہ نسیمِ حیات پرور، یہ کوثر و تسنیم کی جوئے رواں

ہمارے اللہ کا وہ پیغامِ ازلی ہے جو قرآن کریم کی شکل میں دنیا کو اس وقت ملا جب حیاتِ انسانی کے ہر شعبے پر مُردنی چھا چکی تھی اور زندگی کی تاریک رات میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کے نزدیک اس سے بڑھ کر جشن و مسرت کی تقریب اور کوئی نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۭ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ (۱۰ : ۵۷)

"اے انسانو! تمہاری طرف تمہارے پروردگار کی جانب سے (ایک ایسا زندگی عطا کرنے والا پیغام) آگیا (جو سراپا) نصیحت ہے۔ دل کی تمام بیماریوں کیلئے شفا اور ہدایت و رحمت ہے ان کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں۔ اے رسولؐ! تم ان سے کہہ دو کہ یہ اللہ کا فضل ہے اور اس کی رحمت۔ پس چاہیئے کہ اس پر خوشی منائیں (یہ قدرت کا عطیہ) ان تمام چیزوں سے بہتر ہے جسے یہ لوگ دنیا میں جمع کرتے رہتے ہیں۔"

یہ ہے وہ نورِ مبین جس سے رمضان کے مہینے میں چشمِ انسانیت نے بینائی حاصل کی:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ (۲ : ۱۸۵)

"رمضان کا مہینہ جس میں قرآن کا نزول ہوا، وہ قرآن جو انسان کیلئے رہنما ہے۔ ہدایت کی روشن صداقتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور حق کو باطل سے الگ کر دینے والا ہے۔"

اور اسی پاک مہینے میں وہ مبارک رات ہے جس میں نورِ خداوندی کی پہلی جھلک سے دنیا کی نگاہیں آشنا ہوئیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝ لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝ تَنَزَّلُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ سَلٰمٌ ۛ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝ (۹۷ : ۱-۵)

ہم نے اس کتابِ مبین کو عظمتوں والی رات میں نازل کیا ہے۔ تم کیا جانو کہ یہ عظمتوں والی رات کیا ہے؟ وہ رات جو اپنی قدر و قیمت میں ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ جس رات میں فرشتے اور جبریلِ امین اپنے رب کے فرمان کے بموجب امن و سلامتی کی جنّت اپنے آغوش میں لئے دنیا پر نازل ہوتے ہیں۔ حتّٰی کہ دنیا نورِ سحر سے "جگمگا اٹھتی ہے"

اس مقدس رات میں اللہ تعالےٰ کے اس ضابطۂ قوانین کا نزول شروع ہوا جس کا ایک ایک لفظ سرتاپا حق و یقین ہے۔ وَاِنَّہٗ لَحَقُّ الْیَقِیْنِ (۵۱ : ۶۹) جس میں کہیں کسی جگہ شک اور شُبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ (۴۲ : ۴۱) حق کہتے ہی اسے ہیں جو ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ امٹ ہو۔ اپنی جگہ پر قائم ہو حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے۔ علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ اور اس کے برعکس باطل، وہ جو مِٹ جانے والا ہو۔ جو باقی نہ رہ سکے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق ہے۔ باطل کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ علم و دانش ہے۔ توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ کسی خاص مُلک خاص قوم اور خاص جماعت کی ہدایت کیلئے نہیں۔ بلکہ نسلی لسانی، طبقاتی، وطنی، قبائلی حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کیلئے یکساں طور پر آئینِ حیات ہے۔ پھر جس طرح یہ صحیفۂ فطرت مکانی حدود سے بلند ہے۔ اسی طرح زمانی قیود سے بھی نا آشنا ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانے میں یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآنِ کریم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا، اب کسی اور راہبر کی تلاش کرو قطعاً نہیں۔ قرآنِ کریم کی آیات کو کھولتے جائیے۔ جہاں اندر جہاں، زمانہ در زمانہ ان کے پیچ و خم میں لپٹا ملے گا۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی۔ اس کے متعلق ابتدائی انسان اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھ سکتی ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا بھی جا سکتا ہے لیکن پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں اس کی (LATENT PROPERTIES) زمانے کی عقل و علم، تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں گویا وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج پانی سے جس قدر کام لئے جاتے ہیں۔ ابتدائی زمانے میں بھی پانی کے اندر یہ خصوصیتیں موجود تھیں اور آج بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پانی کے اندر جس قدر قوتیں خوابیدہ ہیں وہ سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں۔ اس فضاء کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی آج اس میں ایتھر کی لہروں نے ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے ایتھر تو پہلے بھی موجود تھا۔ اسی خلا میں لپٹا ہوا اس انتظار میں تھا کہ انسانی علم و دانش کی سطح بلند ہوتے ہوتے اس کو آن چھُوئے اور یہ اپنی چھُپی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالے کر دے۔ یہی کیفیت مسلمانوں کے نزدیک قرآنِ کریم کی ہے۔ زمانہ علم و عقل کی جس سطح تک چاہے بلند ہوتا چلا جائے، قرآنِ کریم اس سے بھی آگے نظر آئے گا کہ ہمارا ایمان ہے کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں ہے۔ ہم مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآنِ کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں ضابطۂ قوانین ہے۔ مذہب، سیاست، تمدن، تہذیب، معاشرت، معاشیات غرضیکہ دین و دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس کے اندر ہدایت کے اصول موجود نہ ہوں ایسے اصول جو سب سے محکم اور سیدھی راہ دکھانے والے ہیں۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۱۷ : ۹)

"بلاشبہ یہ قرآن اس راہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو سب سے زیادہ متوازن راہ ہے۔"

یہی وہ توازن بدوش راہ تھی جس پر چل کر ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارہ کرنے والی بادیہ نشین قوم دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر و کسریٰ کی دولت و سلطنت کی وارث بن گئی اور دوسری طرف دنیائے جہانداری و جہانبانی میں حُسنِ اخلاق کے اس مقام تک پہنچ گئی جس کی یاد آج تک دلوں سے محو نہیں ہوئی۔

آج بھی ہم مسلمانوں کے پاس وہی قرآن موجود ہے اور آج بھی اس کی ویسی ہی تلاوت ہوتی ہے۔ اسی رمضان شریف میں دیکھئے اسے لاکھوں مرتبہ دہرایا گیا ہوگا۔ پھر کیا ہے کہ آج مسلمانوں کی حالت عام طور پر ویسی نہیں ہے، جیسی پہلے مسلمانوں کی تھی۔ وجہ ظاہر ہے قرآن کریم قوانین کا مجموعہ ہے اور قوانین ہمیشہ عمل کرنے کیلئے ہوتے ہیں محض پڑھنے کیلئے نہیں ہوتے۔ پڑھا نہیں اس لئے جاتا ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ جب سے یہ علم نگاہوں اوجھل ہوگئی ہم مسلمانوں کی یہ حالت ہوگئی کہ قدم چلتے ہیں لیکن منزل قریب نہیں آتی، کام ہو رہے ہیں لیکن ان کا نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے صاف صاف بتا دیا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (۲۰/۱۲۴)

"اور جو شخص ہمارے قرآن سے روگردانی کرے گا تو اس پر روزی تنگ ہو جائے گی اور قیامت کے دن ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔"

آج دنیا دل کے اضطراب اور رُوح کی پریشانی کے جس جہنم سے گذر رہی ہے۔ ضرورت تھی کہ جس قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی زندہ و پائندہ کتاب کا وارث بنایا تھا وہ انسانیت کو اس پریشانی اور اضطراب سے نجات حاصل کرنے کا راستہ بتاتی۔ لیکن دوسروں کو جگانے والے جب خود ہی سو جائیں تو مخلوق کی حفاظت کس طرح ہو۔ راستہ دکھانے والا جب چراغِ ہدایت کو دامن میں چھپا لے تو منزل تک کیسے پہنچا جائے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود ہمارے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا چاروں طرف سے تھک تھکا کر خود ہی روشنی کی تلاش میں سرگرداں پھر رہی ہے۔ اس لئے روشنی کے علمبردار زمانے کے ہاتھوں مجبور ہونگے کہ اللہ کی دی ہوئی روشنی سے تمام پردے اٹھا کر خود بھی راہِ راست پر ہولیں اور دنیا کو بھی اطمینان اور سکون کی جنّت کا راستہ دکھائیں۔ ہم مسلمانوں نے جب پھر سے ایک مرتبہ قرآنِ کریم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو پھر دیکھئے گا کہ ہم جس مٹی کو ہاتھ لگاتے ہیں وہ کس طرح سونا بن جاتی ہے۔ ہماری ہر آرزو کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ اس وقت ہمیں

معلوم ہوگا کہ لیلۃ القدر کی صحیح عظمت کیا ہے۔ ہم اس کی قدر و قیمت اس وقت پہچانیں گے جب ہمیں قرآن کی قدر ہوگی اور جب قرآن کی قدر ہوگی تو اپنے آپ کی قدر ہوگی اور جب اپنی قدر ہوگی تو قدر و قیمت کے تمام غلط معیار نگاہوں سے گر جائیں گے۔

میں نے قرآنی نظام کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ محض الفاظ کی بندش اور شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ میرے نزدیک ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ نظام کیا ہے۔ کس طرح عمل میں لایا جا سکتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔

پرویز

پاکستان کے مسلمانو!

تم نے اپنی محکومی کے زمانے میں کبھی لالہ زار بلقان کی یاد میں اپنے سینوں کو داغ داغ بنایا اور کبھی مراکش کے غم میں اپنی آنکھوں کو وقفِ خونناب فشاں رکھا۔ گاہ ایران کی ویرانی پر اپنے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی اور گاہ سمرنا کے بچوں کی حفاظت کے لئے اپنی سحر گاہی مناجاتوں کو بامِ عرش تک پہنچایا۔ یہ سب کچھ تم نے اپنی محکومی کی حالت میں کیا، تو کیا اب اپنی آزادی کے زمانہ میں جب کہ تمہارے کشمیری بھائیوں کا خون بہہ رہا ہے تو تم فقط ہڑتالوں پر اکتفا کرو گے۔ سر جوڑ کر بیٹھو اور سوچو کہ کشمیر کے مجاہدوں کو کس چیز کی ضرورت ہے اور پھر اُن کی ہر ضرورت پوری کرنے میں رات دن ایک کر دو۔ خدا شاہد ہے آج اس سے بڑا عملِ صالح اور کوئی نہیں۔

وَ اللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ شَہِیْدٌ

شریا عندلیب

عید جشنِ نزولِ قرآن کا دوسرا نام ہے

رحمتوں اور برکتوں والے رمضان کے باعظمت مہینے کا اختتام اس پُرمسرت تقریب پر ہوتا ہے جسے عید کہا جاتا ہے۔ اس عید کا تعلق بنیادی طور پر نزولِ قرآن سے ہے کیونکہ رمضان کے مہینے میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی (۲:۱۸۵)۔ اس اعتبار سے رمضان المبارک کے ختم ہونے پر منائی جانے والی عید درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُسے بطور جشنِ مسرت منانے کا حکم قرآنِ کریم نازل کرنے والے ربّ العالمین نے دیا ہے۔ سورۂ یونس میں ارشاد ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَ شِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ ۙ (۱۰/۵۷)

"اے نوعِ انسان! (واضح رہے کہ النّاس کہہ کر اللہ تعالیٰ مرد عورت دونوں کو خطاب کرتا ہے کیونکہ نوعِ انسان میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں) تمہاری طرف تمہارے ربّ یعنی تمہارے نشوونما دینے والے کی جانب سے ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کے تمام نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے"

وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ (۱۰/۵۷) اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر ایمان و یقین رکھیں سامانِ نشوونما اور منزلِ انسانیت تک پہنچنے کی راہ نمائی ہے۔ اس کے بعد فرمان ہوتا ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل و رحمت سے ہے (کہ ایسا عدیم النظیر ضابطۂ زندگی مل گیا ہے۔ تم کیا اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا لہٰذا) فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح کسی محنت و معاوضہ کے بغیر مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ وہ متاعِ گراں بہا کہ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ۝ (۱۰/۵۸)۔ انسان جو کچھ بھی جمع کرے یہ اس سے کہیں زیادہ

قیمتی ہے۔ متاعِ کائنات سے گراں تر، سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت خداوند کریم کی یہ آخری کتاب قرآنِ حکیم و عظیم۔ اسی عطیۂ خداوندی کے ملنے پر جشنِ مسرت منانے کی تاکید خدا نے کی ہے۔ چنانچہ رمضان کا پورا مہینہ اس مسرتِ حقیقی کی تیاریوں کے لئے ہوتا ہے اور عیدالفطر جشنِ نزولِ قرآن کی تکمیل کا دن۔ اس حکمِ خداوندی کی تعمیل ہم مسلمان عام طور پر جس طرح کرتے ہیں اس کی صورت یہ ہے کہ رمضان کے روزے رکھنے کا فرض پورا کیا جائے یا نہ کیا جائے عید بڑے ذوق و شوق سے منائی جاتی ہے اور اپنی اپنی بساط کے مطابق ہی نہیں اس سے کہیں بڑھ کر اس میں حصہ لیا جاتا ہے۔ اس کا تو ہمیں اتنا خیال ہوتا ہے کہ اُدھر رمضان شروع ہوا اِدھر ہم عید کے خرچ اخراجات کے بارے میں سوچنے لگے۔ یوں عید کے من چاہے اہتمام کی مشقت ہم پر لازم ہو جاتی ہے۔ مدتوں سے ہمارا یہ وطیرہ چلا آرہا ہے کہ ہم نے عید کی تقریبِ سعید کو ایک رسمی تقریب کا روپ دے رکھا ہے۔ ایک طرف ہم بظاہر عید کی خوشیاں مناتے ہیں اور دوسری طرف ان رسمی خوشیوں پر اُٹھ جانے والے اخراجات کا رونا بھی روتے ہیں کہلاتی تو یہ میٹھی عید ہے لیکن ہم نے اس کی مٹھاس کو بے جا اخراجات اور نمود و نمائش کے تحت کڑوی کسیلی بنا رکھا ہے۔ یہ جشنِ مسرت وہ ہے جو ہم اپنے خود ساختہ مفروضات و تصورات اور اپنی خواہشات و جذبات کے تابع رہ کر مناتے ہیں۔ جہاں تک جشنِ نزولِ قرآن کا تعلق ہے ہمیں یہ توفیق تو حاصل ہے کہ رمضان کے مہینے میں التزاماً قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل ہو۔ ظاہر ہے یہ تلاوت قرآنِ کریم کو ناظرہ پڑھنا اور بار بار اس کے الفاظ زبان سے دہراتے رہنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اُسے ہی بڑا مقدس اور فضیلت کا کام سمجھا جاتا ہے۔ یہی مروجہ عقیدہ ہے، اسی کی پابندی جاری و ساری ہے۔ اس ضابطۂ حیاتِ انسانی کے جب محض الفاظ پڑھ لینے سے ہی فرض اور مقصد پورا ہو جانے کی آسانی حاصل ہو تو کون بدبخت یہ 'عمل' نہ کرے گا!! اس صورتِ حال میں ہم کیا جان سکتے ہیں کہ جشنِ نزولِ قرآن سے مراد کیا ہے۔ کیوں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن ہمیں کیا روشنی دکھاتا ہے اور اس جشن کی خوشی کیا ہوتی ہے؟ تو آیئے قرآن ہی سے پوچھیں کہ ان سوالوں کے جواب وہی دے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آخری، مکمل اور غیر متبدل کتاب کو تمام نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ ہدایت بنایا ہے اور بتایا ہے کہ

> "اس کتاب کے ذریعے اللہ اس قوم کو سلامتی کے راستے دکھاتا ہے جو اس ضابطۂ قوانین سے خود کو ہم آہنگ رکھے۔ وہ انہیں ہر قسم کی تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی جگمگاتی روشنی میں لے آتا ہے اور اس طرح ان کی راہ نمائی زندگی کے سیدھے توازن بدوش راستے کی طرف کر دیتا ہے۔" (۵/۱۶)

یہ ہے نزولِ قرآن کا مقصد۔ دوسری جگہ بتایا ہے۔

> "یقیناً یہ قرآن نوعِ انسان کی راہ نمائی اس راستے کی طرف کرتا ہے جو اقوم ہے۔" (۱۷/۹)

سب سے زیادہ متوازن راہ۔ ہماری زندگی کے قیام کا دارومدار توازن پر ہے۔ جس کا توازن بگڑ جائے چلنا تو ایک طرف وہ اپنے پاؤں پر کھڑا بھی نہیں رہ سکتا۔ یہ قرآن ہے جو افراد اور اقوام یعنی نوعِ انسان کا بگڑا ہوا توازن درست کرتا اور اُسے چلنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ وہ ہمیں ایسے مستقل اقدار و اصول، قوانین اور ضابطے عطا کرتا ہے جو ہماری زندگی کے تمام معاملات اور روز و شب کے معمولات میں رہنمائی کرتے ہیں۔ یوں ہم اس کی روشنی میں صحیح اور غلط راستے کی تمیز کر سکتے ہیں اور منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں راستے پر خود چلنا ہوگا۔ قرآن کے الفاظ پڑھ یا سُن لینے سے قرآن کا بنایا ہوا یہ راستہ طے نہیں ہو جائے گا جو ہم نے سمجھ رکھا ہے۔ بلکہ اس راستے پر چلنے سے انسان ظلمت سے نکل کر نور کی طرف آتا ہے اور اسے اپنے صحیح مقام سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ کیا انسان کے لئے اس سے بڑھ کر جشنِ مسرت منانے کی بات اور کوئی ہو سکتی ہے کہ وہ ظلمت و جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیروں سے نکل کر ابدی روشنی میں آجائے اور اسے عظمت و تکریم کا مقام مل جائے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْهِ ذِکْرُکُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۲۱/۱۰)

"حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب بھیجی ہے" جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے؟"

[illegible] شرف و مجد اور عزت و توقیر بھی ہے۔ اس آیۂ کریمہ سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ اس کتاب [illegible] پر پوری طرح عمل کرنے سے وہ عظیم مقام حاصل ہوتا ہے۔ جو بندے کو خدا کا رفیق بناتا ہے۔ یہی وہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ جو نزولِ قرآن کی بدولت نوعِ انسان کو ملی۔ قرآنِ مبین وہ چراغِ راہ ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے [illegible] ہے۔ ایسا سہارا ہے جو لَا انْفِصَامَ لَهَا کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ وہ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ ہے۔ ایسی شفاءِ کامل جس سے انسان کی ذہنی و جذباتی بیماریاں یکسر دُور ہو جاتی ہیں۔ ذرا غور کیجئے! انسان کی تمام نفسیاتی بیماریاں اور قلبی عوارض کیا دراصل ابلیس و آدم کی اس کشمکش کے آئینہ دار نہیں جو روزِ اوّل سے جاری ہے!

قرآن نے انسان کو ابلیس و شیطان یعنی مایوسی اور سرکشی جو ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں، پر قابو پانے کا طریقہ بتایا ہے اور اس میں اس کی نفسیاتی، ذہنی اور قلبی پیچیدگیوں کا حل رکھ دیا۔ اس کی واحد صورت یہی ہے کہ قرآنی اصول و اقدار کو اپنے اعمال میں سمو کر شیطنت یعنی اپنے سرکش جذبات کو لگام دی جائے۔ نفسیاتی عارضوں کو دُور ہونے میں کچھ دیر نہ لگے گی۔ ایسی عظیم نعمتِ خداوندی کا مل جانا یقیناً اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم رمضان المبارک کے اختتام پر خدائے بزرگ و برتر کا حقیقی معنوں میں شکر بجا لاتے ہوئے میٹھی عید کو جشنِ نزولِ قرآن سمجھ کر اس طرح منائیں کہ قرآنی راستے سے ہمارے قدم سرِ مُو ہٹنے نہ پائیں۔ یہ جو ہمیں زندگی کا آئین ملا ہے اس پر کاربند بننے کے لئے از سرِ نو حلفِ وفاداری اٹھائیں کہ ہم اس کبھی نہ بدلنے والے آئین سے کبھی بھی انحراف نہ کریں گے۔

اس عہد و ایمان کے ساتھ جب ہم اگلے سال میں قدم رکھیں گے تو اس صراطِ مستقیم پر چلانے کے لئے اعمالِ صالحہ ہمارا سہارا بن جائیں گے۔ ہمارے لئے پھر آنے والا رمضان المبارک نویدِ جشنِ نزولِ قرآن لئے اپنے بازو کھول دیگا! یہی منشائے ایزدی اور یہی مقصودِ فطرت ہے۔

رابطۂ باہمی

انسانی زندگی، واقعات و حادثات کا ایک غیر مختتم سلسلہ ہے جس کے بارے میں چند ساعتوں کی بھی پیشگوئی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم طلوعِ اسلام سے منسلک بہن بھائیوں کو (جو ایک آفاقی نصب العین کی خاطر اپنی مخلصانہ کوششیں وقف کئے ہوئے ہیں) ایک دوسرے کی خوشیوں، مشکلات اور دشواریوں کا علم ہونا چاہیئے تاکہ ہم بہن بھائیوں میں سے جب بھی (خدانخواستہ) کسی کو کسی قسم کے نامساعد حالات کا شکار ہونا پڑے تو دوسرے بہن بھائی اسے تنہائی کے جانگسل احساس سے بچا سکیں۔ اس ضمن میں طلوعِ اسلام میں رابطہ باہمی کے نام سے ایک عنوان مختص کر دیا ہے۔ احباب سے التماس ہے کہ وہ جدوجہدِ حیات کے روز و شب میں وقوع پذیر ہونے والے انوکھے، اجنبی، تلخ و خوشگوار تجربات سے ایڈیٹر کو مطلع فرمائیں تاکہ غم اور خوشی کے لمحات میں دوسرے بہن بھائی ان کے شریکِ حال رہ سکیں۔

ایڈیٹر

اُسوۂ حَسَنہ

(اربابِ شریعت کی خصوصی توجہ کے لئے)

رسول اللہ خدا کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات (دین) لائے جس پر سب سے پہلے حضورؐ نے خود عمل فرمایا۔ آپؐ کے اس عمل کو عام اصطلاح میں سنت کہا جاتا ہے جس کا تحریری ریکارڈ احادیث کے ان مجموعوں میں ملتا ہے جو مختلف ائمہ حدیث نے وقتاً فوقتاً مرتب کئے۔ چونکہ یہ مجموعے حضورؐ کی وفات کے بہت بعد مرتب ہوئے۔ اس لئے ان میں صحیح باتوں کے ساتھ غلط باتیں بھی شامل ہوگئیں۔ چونکہ رسول اللہؐ کی ساری زندگی قرآن ہی کے اتباع میں گذری تھی اور قرآن ہمارے پاس اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے ان مجموعوں میں جتنی باتیں ایسی ہیں جو قرآن کے خلاف نہیں جاتیں۔ ان کے متعلق تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ وہ صحیح ہیں۔ اس طرح قرآن کی روشنی میں اس ریکارڈ سے رسول اللہؐ کی ایسی سیرت ہمارے سامنے آجاتی ہے جو ہمارے لئے زندگی کی تاریکیوں میں شمع ہدایت اور تمام نوعِ انسانی کے لئے روشنی کے جگمگاتے مینار کا کام دیتی ہے۔ اسی کو رسول اللہ کا اُسوۂ حسنہ کہتے ہیں۔ یعنی وہ ماڈل جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان زندگی کے مقصود و منتہیٰ تک پہنچ جاتا ہے۔ طوبیٰ لہم وحسن مآب۔

جزئیات کو چھوڑ کر بہ ہیئت مجموعی حضورؐ نے جس انداز کی زندگی بسر کی۔ اس کے مطابق علامہ شبلی نے مختلف کتب روایات و سیر حوالوں سے سیرۃ النبی (جلد اول) میں حسبِ ذیل تفصیل لکھی ہے۔

مصنفین یورپ کا عام خیال ہے کہ آنحضرتؐ جب تک مکہ معظمہ میں تھے، تو پیغمبر تھے، مدینہ پہنچ کر پیغمبر سے بادشاہ بن گئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپؐ تمام عرب کے زیرنگیں ہوجانے پر بھی فاقہ کش رہے۔ صحیح بخاری، باب الجہاد میں روایت ہے کہ وفات کے وقت آپؐ کی زرہ ایک یہودی کے ہاں تین صاع جَو پر گرو تھی۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی، ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب تمام عرب حدودِ شام سے لے کر عدن تک فتح ہو چکا ہے اور مدینہ کی سرزمین میں زر و سیم کا سیلاب آچکا ہے...... حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ولا یطوی لہ ثوب کبھی آپؐ کا کوئی کپڑا تہہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا کپڑا ہوتا تھا۔ دوسرا نہیں ہوتا تھا جو تہہ کر کے رکھا جا سکتا۔

گھر میں اکثر فاقہ رہتا تھا اور رات کو تو اکثر آپؐ اور سارا گھر بھوکا سوتا تھا۔

کان رسول اللہ یبیت اللیالی المتتابعۃ طاویا ھو و اھلہ لا یجدون عشاء۔

آپؐ اور آپؐ کے اہل و عیال مسلسل کئی کئی رات بھوکے رہ جاتے تھے کیونکہ رات کا کھانا میسر نہیں ہوتا تھا۔

پیہم دو دو مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے ایک موقعہ پر جب یہ واقعہ بیان کیا تو عروہ بن الزبیر نے پوچھا کہ آخر گذارا کس چیز پر تھا؟ بولیں کہ پانی اور کھجور پر۔ البتہ ہمسائے کبھی کبھی بکری کا دودھ بھیج دیتے تھے، تو پی لیتے تھے۔ آپؐ نے تمام عمر کبھی چپاتی کی صورت نہیں دیکھی۔ میدہ جس کو عرب میں حواری اور لقی کہتے ہیں کبھی نظر سے نہیں گذرا۔ سہل بن سعد جو اس واقعہ کے راوی ہیں، ان سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا آں حضرتؐ کے زمانہ میں چھلنیاں نہیں تھیں، بولے نہیں۔ لوگوں نے کہا پھر آخر کس چیز سے آٹا چھانتے تھے۔ بولے منہ سے پھونک کر بھوسی اڑا دیتے تھے۔ جو رہ جاتا تھا اسی کو گوندھ کر پکا لیتے تھے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ تمام عمر یعنی مدینہ کے قیام سے وفات تک آپؐ نے کبھی دو وقت سیر ہو کر روٹی نہیں کھائی۔

ایک دفعہ ایک شخص خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا کہ سخت بھوکا ہوں۔ آپؐ نے ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے ہاں کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو بھیجدو۔ جواب آیا کہ گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں۔ آپؐ نے دوسرے گھر کہلا بھیجا۔ وہاں سے بھی یہی جواب آیا۔ مختصراً یہ کہ آٹھ نو گھروں میں سے کہیں پانی کے سوا کھانے کی کوئی چیز نہ تھی۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپؐ نے شکم کو کپڑے سے کس کر باندھا ہے۔ سبب پوچھا، تو حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ بھوک کی وجہ سے۔

ایک دفعہ صحابہ نے آں حضرتؐ کی خدمت میں فاقہ کشی کی شکایت کی اور پیٹ کھول کر دکھایا کہ پتھر بندھے ہیں۔ آپؐ نے شکم کھولا، تو ایک کے بجائے دو دو پتھر تھے۔ (صفحہ ۳۴۹ تا صفحہ ۳۵۲)

یہ تو رہا زندگی بھر کا معمول۔ اب عمر کے آخری وقت کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔

"بیہقی کی روایت ہے کہ اس بیماری (مرض الموت) کے ایام میں حضورؐ کے پاس سات دینار تھے اور حضورؐ فرماتے تھے کہ انہیں صدقہ کر دو لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپ کو ہوش ہوا، تو فرمایا کہ انہیں لے آؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھ کر فرمایا کہ محمدؐ کا اپنے رب پر کیا گمان ہو گا جب کہ وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ ہو۔ پھر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔"

(اصح السیر۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری صفحہ ۲۵۰)

نیز سیرۃ النبی شبلی حصہ اوّل (صفحہ ۱۶۹)

یہ تھی وفات کے قریب کی مالی حالت۔ وفات کے بعد (ترکہ) کے متعلق اسی اصح السیر میں ہے۔

"یہ معلوم ہو چکا ہے کہ مرض الموت میں وفات کے قریب حضورؐ کے پاس کل سات دینار تھے اس کو خود حضورؐ نے اپنے ہاتھ سے صدقہ کر دیا تھا۔ چند مکانات تھے۔ وہ ازواجِ مطہرات پر بٹے ہوئے تھے اور انہیں کے قبضے میں تھے..... کچھ زمینیں تھیں۔ جلیل القدر اصحاب میں اس کی ملکیت کے متعلق اختلاف ہیں مگر صحیح یہی ہے کہ وہ فئی یا صدقہ کی زمینیں تھیں اور من جانب اللہ اس پر تصرف کا حضورؐ کو کامل اختیار تھا۔ لیکن وہ ذاتی ملکیت نہ تھی جس میں وراثت جاری ہو سکے۔"

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔

مَا ترك رسول الله درهما ولا دينارًا ولا شاةً ولا بعيرًا ولا اوصى بشى (رواہ مسلم) حضورؐ نے نہ درہم چھوڑا نہ دینار، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔ اُمّ المومنین حضرت جویریہؓ کے بھائی عمرو بن الحارثؓ کی روایت بخاری میں ہے۔ مَا ترك رسول الله عند موته دينارًا ولا درهمًا ولا عبدًا ولا امة ولا شيئًا الا بغلة البيضاء ولا سلاحه وارضًا جعلها صدقة رسول اللہؐ نے وفات کے وقت نہ دینار چھوڑا نہ درہم، نہ غلام نہ لونڈی، نہ کوئی اور شے۔ لیکن ایک سفید خچر اور سلاحِ جنگ اور زمینیں، جسے حضورؐ نے صدقہ کر دیا تھا"۔ (ص ۵۴۵)

علامہ شبلی نے "متروکات" کے عنوان کا آغاز ہی ان الفاظ سے کیا ہے۔

"آں حضرتؐ نے جب انتقال فرمایا تو اپنے مقبوضات و جائداد میں سے کیا کیا چیزیں ترکہ میں چھوڑیں اس سوال کا اصل جواب تو یہ ہے کہ آپ خود اپنی زندگی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے اور کچھ تھا بھی، تو اس کے متعلق عام اعلان فرما چکے تھے کہ لا نورث ما ترکنا صدقة ہم (انبیاء) کا کوئی وارث نہیں ہوتا، جو چھوڑا وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔" (ص ۱۸۵)

(اس کے بعد انہوں نے بھی اپنی روایات کو درج کیا ہے جو اوپر لکھی جا چکی ہیں۔)

یہ ہے حضورؐ کی معاشی زندگی کا وہ مجموعی نقشہ جو کتبِ روایات کی رُو سے مرتب ہوتا ہے۔ یہ روایات حدیث کے مختلف مجموعوں میں ہیں۔ لیکن (جہاں تک ہمیں معلوم ہے) ان کی صحت کے متعلق کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ان سے یہ واضح ہے کہ:

(۱) نبی اکرمؐ نے (بادشاہی کے زمانہ میں بھی) نہایت سادہ زندگی بسر فرمائی۔ ایسی سادہ کہ حضورؐ نے کبھی فالتو جوڑا کپڑوں کا بھی نہ رکھا۔

(۲) حضورؐ نے اپنے پاس کبھی مال جمع نہیں کیا۔ جو کچھ آتا تھا' اس سے اپنی کم از کم ضروریات پوری کرنے کے بعد باقی رفاہِ عامہ کے لئے صرف کر دیتے تھے۔

(۳) حضورؐ نے کوئی جائیداد یا مال ترکہ میں نہیں چھوڑا۔ جو کچھ اشیائے مستعملہ میں سے چھوڑا' اس کے متعلق بھی فرما دیا کہ وہ عام مسلمانوں کا حق ہیں۔

ہمارے نزدیک حضورؐ کی حیاتِ طیبہ کا یہ نقشہ اس لئے صحیح ہے کہ یہ قرآن کے منشار کے عین مطابق ہے۔ حضورؐ جس قرآنی نظام کے قیام کے لئے تشریف لائے تھے' اس میں نہ روپیہ جمع کرنے کی اجازت ہے' نہ زمین وغیرہ پر ذاتی ملکیت جائز۔ اور جب یہ صورت ہو کہ نہ کسی کے پاس جمع شدہ روپیہ ہو اور نہ ہی ذاتی جائیداد' تو پھر ترکہ اور وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (قرآن میں وراثت کے جو احکام ہیں وہ اس عبوری دور کے لئے ہیں جس میں ہنوز وہ نظام قائم نہ ہوا ہو۔ ویسے بھی وراثت کے احکام اسی پر نافذ ہوں گے جو ترکہ چھوڑ کر مرے۔ جس کا کچھ ترکہ ہی نہ ہو' اس پر ان احکام کا اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ باقی رہی سادگی یا غریبی کی زندگی' سو اسلام آسائش اور خوشحالی کی زندگی سے منع نہیں کرتا' لیکن حضورؐ جس قرآنی نظام کے داعی تھے اس میں آپؐ خوشحالی کی زندگی بسر نہیں کر سکتے تھے جب تک باقی تمام افراد بھی اتنے ہی خوشحال نہ ہو جاتے۔ آج بھی اگر کوئی جماعت اس نظام کے قیام کے لئے اٹھے گی' تو اسے اس قسم کے فقر و فاقہ کو اپنے سر لینا ہو گا۔ اس میں صدرِ مملکت کی زندگی سب سے زیادہ سادگی اور غریبی کی زندگی ہو گی۔ البتہ جوں جوں معاشرہ خوشحال ہوتا جائے گا وہ بھی اسی نسبت سے خوشحالی کی زندگی بسر کرے گا۔ اس نظام کے السابقون الاوّلون کے لئے تو پیہم محنت و مشقت اور عسرت و افلاس کی زندگی ہوتی ہے اور یہ سب کچھ ان کا اپنے اوپر خود عائد کردہ ہوتا ہے کیونکہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وہ خود عائد کردہ عسرت تھی جس کی وجہ سے حضورؐ اس قدر غریبی کی زندگی بسر فرماتے تھے۔

بہرحال یہ بات ہم نے محض ضمناً لکھ دی ہے، جو کچھ ہم کہہ رہے تھے وہ یہ تھا کہ حضورؐ کی زندگی کا جو نقشہ کتبِ سیرت سے مرتب ہوتا ہے وہ سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ یہاں سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جب رسول اللہ کی زندگی یہ تھی' تو اسی کو امت کے لئے اسوۂ حسنہ ہونا چاہیئے لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ حضورؐ کی اس زندگی کے متعلق وعظوں اور خطبوں میں تو بہت کچھ کہا جاتا ہے لیکن اسے بطور سنت یا اسوۂ حسنہ پیش نہیں کیا جاتا' نہ ہی اس پر عمل کیا جاتا اور کرایا جاتا ہے۔ سادہ زندگی بسر کرنے کی تلقین ضرور کی جاتی ہے لیکن از روئے شریعت جن باتوں کو ممنوع بتایا جاتا ہے وہ صرف مردوں کے لئے سونا اور ریشم پہننا اور چاندی اور سونے کے برتنوں میں کھانا پینا ہے۔ جہاں تک مال جمع کرنے کا تعلق

ہے یہ کھلے بندوں کہا جاتا ہے کہ نہ اس پر کسی قسم کی پابندی ہے، نہ کوئی حد بندی۔ جائز ذرائع سے جس قدر مال جمع کر لیا جائے شریعت کی رُو سے درست ہے بشرطیکہ اس میں سے زکوٰۃ نکال دی جائے۔ اس طرح ترکہ میں بھی جس قدر مال اور جائداد چھوڑی جائے، سب جائز ہے۔ بس اس کی تقسیم شریعت کے مقرر حصوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔

سوال یہ ہے کہ اگر لاکھوں روپے جمع کر کے رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں، اگر ان میں سے زکوٰۃ دے دی جائے اور بیحد و نہایت جائداد بنا لینے اور اسے چھوڑ مرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر وہ میراث کے قاعدے کے مطابق تقسیم ہو جائے۔ تو پھر نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ سے کیا مفہوم ہے؟ اور وہ کن کے لئے اسوہ ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اُس قسم کی زندگی صرف رسول اللہ کے لئے مختص تھی۔ عام مسلمانوں کے لئے نہیں تھی، تو ایک تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ جتنے احکام رسولؐ اللہ کی ذات سے مخصوص تھے قرآن نے ان کی خود تصریح کر دی ہے۔ مثلاً ازواج مطہرات کو تبدیل نہ کر سکنے کا حکم یا ان کے امہات المومنین ہونے کا حکم۔ قرآن نے اس کی تصریح کہیں نہیں کی کہ حضورؐ نے جس قسم کی مالی زندگی بسر فرمائی تھی۔ وہ اللہ کے احکام کے تابع تھی جو حضورؐ کے لئے مختص تھے۔ پھر دوسری بات یہ کہ اگر حضورؐ کی یہ ساری زندگی احکام خصوصی کے تابع تھی جن کا اطلاق دوسرے مسلمانوں پر نہیں تھا، تو یہ زندگی امت کے لئے اسوہ کس طرح بن سکتی ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ حضورؐ کی زندگی مکمل اسلام کی مظہر تھی جس تک امت کے افراد نہیں پہنچ سکتے، تو پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندگی جس تک پہنچنا دوسرے افراد کے لئے ناممکن ہو، وہ ان کے لئے اسوہ (ماڈل) کیسے بن سکتی ہے؟ یہ تصور قرآنی تعلیم کے بھی خلاف ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ چونکہ دنیا میں انسان بستے ہیں، اس لئے ہم نے انسانوں میں سے رسول بھیجے۔ مگر یہاں فرشتے بستے، تو ہم فرشتوں کو رسول بنا کر بھیجتے (۱۷/۹۵) نیز قرآن میں اسوہ حسنہ کا لفظ خصوصیت سے دو ہی شخصیتوں کے متعلق آیا ہے۔ ایک حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں کے متعلق (۶۰/۴) اور دوسرے نبی اکرمؐ کے متعلق[1] (۳۳/۲۱) حضرت ابراہیمؑ کی جس خصوصیت کبریٰ کے تذکرہ کے بعد اسوہ حسنہ کہا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو لوگ اس پیغام خداوندی کے مخالف ہیں ان سے کوئی قلبی تعلق نہ رکھا جائے۔ بعینہٖ یہی حکم دوسری جگہ عام مسلمانوں کے لئے بھی آیا ہے (۶۰/۱۳)۔ اس سے ظاہر ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے حضرت ابراہیمؑ کے اس خصوصیت تک پہنچنا ناممکن ہوتا، تو پھر انہیں بالتصریح اس خصوصیت کا حکم نہ دیا جاتا۔ یہی چیز نبی اکرمؐ کے اسوہ حسنہ پر صادق آتی ہے۔ یعنی اگر مسلمانوں کے لئے اس تک پہنچنا ناممکن ہوتا، تو اسے ان کے لئے اسوہ قرار کیوں دیا جاتا؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ بات ناممکن کی نہیں بلکہ درجات کی ہے۔ جو مسلمان ان امور سے رُک جاتا ہے جنہیں شریعت

---

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرآن کریم میں رسول اللہ کے اسوہ حسنہ کا ذکر اس مقام پر آیا ہے جہاں آپؐ نے جنگ کے موقع پر بے مثال استقلال اور استقامت کا ثبوت دیا تھا اس لئے اس (اسوہ) کا تعلق اسی واقعہ سے ہے۔ دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ اس سے حضورؐ کی پوری کی پوری زندگی کی طرف اشارہ ہے۔ اس مقام پر ہم عموم اور خصوص کی بحث میں نہیں اُلجھنا چاہتے۔

نے ناجائز قرار دیا ہے تو وہ دین کے پہلے درجے میں آجاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جس قدر اس میں پختگی حاصل کرتا اور آگے بڑھتا جاتا ہے اس کے درجات بلند ہوتے جاتے ہیں۔ رسولؐ اللہ ان مدارج کی بلند ترین سطح پر فائز تھے۔ لہٰذا پہلے درجہ کا مسلمان بھی متبع سنت ضرور ہوتا ہے۔ جوں جوں وہ اتباعِ سنت میں ترقی کرتا جاتا ہے حضورؐ کے اسوہ حسنہ کے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے تا آنکہ وہ آخر الامر اسی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس چودہ سو سال میں امت کو اس آخری درجہ تک لانے کے لئے کیا کوششیں ہوئی ہیں؟ سابقہ تاریخ کو تو چھوڑیئے، ہمارے دور میں تو یہی کیفیت ہے کہ جو مسلمان پہلے درجہ میں آجاتے ہیں انہیں مطمئن رکھا جاتا ہے کہ انہوں نے دین کا منشار پورا کر دیا ہے اور وہ متبعین سنتِ رسولؐ اللہ بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے زمیندار، کارخانہ دار، صاحبِ جائیداد، وہ زر اندوز جنہوں نے کروڑوں روپے جمع کر رکھے ہیں، اگر وہ زکوٰۃ ادا کر دیتے ہیں یا اربابِ شریعت کے بتائے ہوئے کاموں میں کچھ خیرات کا روپیہ دیدیتے ہیں، تو انہیں متبعینِ شریعت ہونے کی سند مل جاتی ہے وہ خدا اور رسول کی رضا جوئی حاصل کر لیتے ہیں اور دین کا منشار پورا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد ان سے کوئی نہیں کہتا کہ اتباعِ سنت اسی صورت میں مکمل ہوگی جب تم حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں ایسی زندگی بسر کرو گے کہ نہ تمہارے پاس کچھ جمع ہو اور نہ ہی تم کچھ ترکہ چھوڑو۔

ہم پاکستان کے اربابِ شریعت سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ

(۱) نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کا جو مجموعی نقشہ کتبِ سیرت کی رو سے پیش کیا گیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟

(۲) اگر وہ صحیح ہے تو امت کے لئے اس اسوہ حسنہ کی اتباع ضروری ہے یا نہیں؟

(۳) اگر اس کی اتباع ضروری ہے، تو جو لوگ لاکھوں روپے جمع کرتے اور کروڑوں کی جائیدادیں بناتے ہیں اور ساری عمر یہی کچھ کرتے رہتے ہیں۔ انہیں متبع سنتِ رسولؐ اللہ سمجھا جائے گا یا نہیں؟

(۴) اگر وہ لوگ متبع سنت رسولؐ اللہ نہیں، تو پاکستان کے مسلمانوں کو اس سنتِ نبویؐ پر چلانے کے لئے یہاں کوششیں ہو رہی ہیں؟

اگر کوئی تحریک اس اتباعِ سنت کی دعوت دے اور ایسے اسلامی معاشرہ کے قیام کی کوشش کرے جس میں حضورؐ کے اس اُسوۂ حسنہ کی اتباع ممکن اور آسان ہو جائے، تو ایسی تحریک کی تائید کرنی چاہیئے یا مخالفت؟

جو حضرات اس اہم موضوع پر سنجیدگی سے گفتگو کرنا چاہیں، طلوعِ اسلام نہایت خندہ پیشانی سے انہیں خوش آمدید کہے گا۔

(طلوعِ اسلام اگست ۱۹۵۵ء سے ماخوذ)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

علی محمد چدھڑ

تصوّف جمہوریّت اور سوشلزم

روزنامہ جنگ مورخہ ۱۸ جنوری ۹۲ء کے سیاسی ایڈیشن میں زبیر رانا صاحب نے نیو ورلڈ آرڈر کے حوالہ سے بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اپنے مقالہ کے آخر میں پاکستانی عوام کو انہوں نے ترغیب دی ہے کہ امریکی سرمایہ داری کے خلاف پوری دنیا کی قومیں اور محنت کش طبقے متحد ہو کر جو تحریک چلا رہے ہیں اس میں شامل ہو جائیں۔ تحریک کا نعرہ یہ ہے کہ تصوّف، جمہوریت اور سوشلزم کو متحد کر کے نئے راستے بنائے جائیں۔ رانا صاحب کے خیال کے مطابق اس سے نہ صرف سُپر طاقتوں کی بالادستی ختم ہو جائے گی۔ بلکہ ہتھیاروں کا پھیلاؤ کم ہونے سے عالمی امن کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔ ساتھ ہی جیسا کہ موضوع سے ظاہر ہے۔ اخلاقی اقدار اور اقتصادی مساوات کو بھی فروغ حاصل ہو گا اور یہ دنیا خالقِ کائنات کی مرضی کے مطابق ایک مثالی دنیا بن جائے گی۔ رانا صاحب کے مقالہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"سرمایہ دارانہ نظام مغربی ممالک سے نکل کر اگر پوری دنیا کو ایک ہی نظام میں منتھی کر رہا ہے تو اس کے جواب میں پوری دنیا کی قومیں اور محنت کش طبقے بھی عالمی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس عالمی طبقاتی تحریک کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ کر پاکستان کے عوام بھی اپنا مستقبل سنوار سکتے ہیں۔ لیکن اس مقصد کے لئے ہمیں فرقہ پرستی کی جگہ بین الاقوامی طبقہ کی تحریک چلانا ہو گی۔ روس کی مسلمان ریاستوں کی ثقافتوں کے ساتھ رشتے جوڑنے ہوں گے اور اپنے ملک کی ثقافت کو قدامت پسندی کی بجائے ماڈرن شکل میں ابھارنا ہو گا۔ اگر ماضی والی بنیاد پرستی چلتی رہی تو ہم جنونی انداز میں چلنے والوں کی طرح نقصان اٹھائیں گے۔ اس مقصد کے لئے امریکی سرمایہ داری کے خلاف عالمی سطح پر یہی نعرہ لگ رہا ہے کہ تصوّف، جمہوریت اور سوشلزم کو متحد کر کے نئے راستے بنائے جائیں ہتھیاروں

کے پھیلاؤ کو روکا جائے اور سپرطاقتوں کی بالادستی ختم کی جائے۔"

ایک مغربی مفکر کا قول ہے۔ "کوئی شخص خواہ کتنا ہی عقل مند کیوں نہ ہو اپنے شعوری افعال کے فیصلہ کن محرکات کے متعلق محض علت و معلول کے قانون کی رُو سے کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔" انسانیت کا کارواں رواں دواں ہے۔ اس کی تاریخ ناکام تجربات کی مسلسل داستان ہے۔ اپنی عقل و فہم کے مطابق وہ ایک نظریہ قائم کرتا ہے۔ پھر اُسے اپنے تجربات کی بھٹی سے گزارتا ہے۔ لیکن صدیوں کی ہزارہا مشقتوں اور لاتعداد مصائب و آلام کے بعد اُسے پتہ چلتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔ اس کے بعد وہ اس کی جگہ کوئی اور نظریہ وضع کر لیتا ہے جو عموماً پہلے نظریہ کے اُلٹ ہوتا ہے۔ پہلے کی طرح اس پر بھی تجربہ شروع کر دیتا ہے۔ وہ نظریہ بھی اسی قسم کے ان گنت کمر توڑ مراحل سے گزر کر ناکام ثابت ہوتا ہے۔ ان تجربات اور نظریات کا تعلق انسانی زندگی کی معاشرت، معیشت، سیاست غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے سے ہوتا ہے۔ آج جو حضرت انسان موجودہ تہذیب کی جدید ترین STAGE پر پہنچا ہے وہ اسی قسم کے عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ سوویٹ یونین کی عظیم سلطنت ایک ہنگامی انقلاب کے نتیجہ میں قائم ہوئی اور پون صدی تک ایک سپرطاقت کی حیثیت سے دنیا پر اپنا سکہ اور دھاک بٹھانے کے بعد بکھر گئی۔ ساری دنیا پر غلبہ کے عزائم رکھنے والی سوویٹ یونین کا اپنا وجود ہی ناپید ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مارکس کا انسانی بہبود کا نظریہ اور فلسفہ سب کا سب باطل ثابت ہو گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ سرمایہ داری کے ردِ عمل کے طور پر قائم ہونے والی اکائیاں ۷۵ سال کی صحرانوردی کے بعد پھر نظامِ سرمایہ داری کی پناہ میں آ رہی ہیں۔ یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہی کہ صدیوں کی جانکاہ مشقتوں اور زہرہ گداز صعوبتوں اور تباہ کن جنگوں کے بعد معلوم ہوا کہ اشتراکی نظریہ اور نظام غلط تھا۔ یہ تو تھا اس نیرنگیٔ زمانہ کا ایک پہلو۔ بہر حال یہ غلط نظام جب تک [illegible] رہا۔ سرمایہ داری کے مقابلہ میں ایک بیلنس آف پاور کا کام کرتا رہا۔ اس کے خاتمہ سے امریکی اور مغربی [illegible] کا سرمایہ داری نظام اب دیوِ استبداد بن کر ساری دنیا کو نگل رہا ہے جس کے نتیجے میں عالمی سطح پر پوری دنیا کی قومیں اور محنت کش طبقے متحد ہو کر ایک تحریک چلا رہے ہیں جس کا پروگرام ہے کہ تصوف، جمہوریت اور سوشلزم کو متحد کر کے نئے راستے بنائے جائیں تاکہ یہ دنیا امن و امان کا مسکن اور جنت کا نمونہ بن سکے۔

اب آتے ہیں اپنے اصل موضوع کی طرف یعنی امریکی سرمایہ داری کی روک تھام یا بچاؤ کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے۔ بقول رانا صاحب عالمی سطح پر ایک تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی ہے جس کا منشور یہ ہے کہ تصوف، جمہوریت اور سوشلزم کے باہمی ملاپ کے ذریعہ ایک نیا نظام قائم کیا جائے جو نئے عالمی نظام یا نیو ورلڈ آرڈر کے سامراجی ڈھانچہ کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نئے عالمی نظام کے تحت امریکہ اپنے حواری سرمایہ دار ممالک کی قیادت کے ذریعہ تمام دنیا پر بلا شرکت غیرے اپنا سیاسی، اقتصادی اور

فوجی تسلّط چاہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ تصوّف، جمہوریت یا سوشلزم میں وہ کون سے راہ نما اصول ہیں جو سرمایہ داری کے اس طوفان کے آگے بند باندھ سکیں۔ جہاں تک سوشلزم کا تعلّق ہے ساری دنیا جانتی ہے کہ اس نظام کے قلعہ میں خود سرمایہ داری نے نقب لگائی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نام نہاد فلاحی نظام کے شکنجے سے نکل کر دنیا سرمایہ داری سسٹم کی طرف دوڑ رہی ہے۔ جس سامراج کو لینن کمیونزم کے ہاتھوں شکست دینا چاہتا تھا۔ آج وہی استحصالی نظام عالمی غلبہ کے شادیانے بجا رہا ہے اور سوشلسٹ سماج کے دیوتا لینن کے پجاری نانِ شبینہ کو ترس رہے ہیں۔ دراصل سوشلزم کی اصطلاح بڑی پُرکشش لیکن موہوم اور ذومعنی ہے۔ افسوس کہ اس کے سنہری اصول عملی طور پر انسان کو کچھ نہ دے سکے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کے معاشی نظام کی بنیاد مکمّل طور پر مادی تصورِ حیات پر ہے اور اس کے پیچھے کوئی جذبہ محرّکہ کام نہیں کرتا جس سے یہ سسٹم بنی نوعِ انسان کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ آج جتنے بھی سوشل ممالک ہیں ان کا شمار ترقی پذیر یا پسماندہ ریاستوں میں ہی ہوتا ہے۔ مختصر طور پر یہ کہ سوشلزم جسے معاشرتی، معاشی اور سیاسی طور پر ویلفیئر کا نام دیا جاتا ہے، نظریاتی طور پر تو درست ہے۔ لیکن عملی اور تجرباتی طور پر اپنی ابتدائی سٹیج پر ہی ناکام ہو چکا ہے۔

یہی حال مروّجہ جمہوریت کا ہے۔ رُوسو اور لاک کے نظریات پر مبنی اس طرزِ حکومت کو ڈیماکریسی بھی کہتے ہیں۔ جس کی بنیاد حسبِ ذیل مفروضات پر قائم ہے:۔

(۱) حکومت میں حاکم اور محکوم کا امتیاز نہیں رہتا۔ اس میں عوام خود اپنی حکومت قائم کرتے ہیں۔

(۲) عوام کا منشا ان کے نمائندگان کے ذریعہ معلوم ہو سکتا ہے۔

(۳) کسی فیصلے کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ان نمائندگان کی اکثریتِ رائے پر ہوتا ہے۔

(۴) اقلیت کو اکثریت کے فیصلے صحیح تسلیم کرنے پڑتے ہیں اور تمام افرادِ مملکت پر ان کی اطاعت لازمی ہوتی ہے۔ شروع شروع میں تو بادشاہت اور ملوکیت کے ستم رسیدہ لوگوں نے اس نظامِ حکومت کی خوشی میں کافی جشن منائے اور شخصی حکومت کی ستائی ہوئی انسانیت نے سکھ کا سانس لیا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ طریق حکومت مغرب سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گیا تو اس کے نتائج بتدریج بے نقاب ہونے لگے۔ یہاں تک کہ اُسی مغرب نے اس اندازِ حکومت کو تباہی کا ایک بڑا سبب قرار دے دیا۔

ایک اقتباس ہے:۔

"جمہوریت نظری طور پر تو اپنے آپ کو مثالی نظام محسوس کر سکتی ہے لیکن عملی طور پر یہ ایک ناممکن نظریہ ہے۔ ایک مکمّل جمہوریت بھی اس حد تک جمہوری نہیں ہو سکتی جس حد تک یہ نظریہ جمہوریت اسے جمہوریت بتاتا ہے۔"

۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ کی ثقافتی مجلس (UNESCO) نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بنائی تھی۔ جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ جمہوری نظامِ حکومت کے متعلق سائنٹیفک انداز سے چھان بین کرے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق معلوم ہوا کہ "جمہوریت کی اصطلاح بالکل مبہم ہے۔ آج تک اِس کا مفہوم ہی متعین نہیں ہو سکا اور یہ بھی کہ یہ سمجھنا غلط ہے کہ اکثریت کا فیصلہ غلطی سے پاک ہوتا ہے۔ وہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلے کے خلاف اپیل کرے اور اُسے بدلوا دے۔"

لندن یونیورسٹی کے پروفیسر الفریڈ کوبن اپنی کتاب (CRISIS OF CIVILISATION) میں لکھتے ہیں کہ "جمہوریت میں "عوام کے اقتدارِ اعلیٰ" کو صرف نظری حیثیت حاصل ہے۔ عملی حیثیت سے دیکھا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات سے ہے اور یہ بھی کہ فیصلہ وہی صحیح ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔"

پروفیسر ہوڈ کہتے ہیں کہ "جمہوری اندازِ حکومت میں فیصلے سروں کی گنتی سے ہوتے ہیں۔ ہر سر ایک ووٹ، خواہ ایک سر مفکر کا اور دوسرا گدھے کا ہی کیوں نہ ہو۔"

علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ "جمہوریت ایک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ خیر یہ تو تھا ایک منفی پہلو۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر یہ لوگ اب چاہتے کیا ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ حکومت انسانوں کی نہیں قانون کی ہونی چاہیے۔ لیکن وہ قانون ملے گا کہاں سے۔ اس کا جواب مشہور سائنسدان آئن سٹائن کی زبان سے سنئے۔ وہ اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں لکھتا ہے۔" سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہے۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ کیا ہونا چاہیئے۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں ہوتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔"

مشہور اطالوی مدبر میزینی (MAZZINI) اس باب میں اور وضاحت سے لکھتا ہے:۔

> "اس میں شُبہ نہیں کہ عام رائے دہندگان کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریقہ کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت آپ قائم کر سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدتِ عقائد نہ ہو۔ جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت آمریت) یا زیادہ انسان (جمہوریت) بات ایک ہی ہے۔ یاد رکھیے جب تک

کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لئے ہے۔ اگر وہ اس فریضہ کی انجام دہی کے لئے قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔"

(INTERPRETATERS OF MAN, P 46-47)

یہ تو تھا ایک طرزِ حکومت "جمہوریت" کا مختصر سا جائزہ صرف اِس اضافے کے ساتھ کہ ہمارے لئے ان قرینی سطور میں مقامِ غور یہ ہے کہ ان مغربی مفکّروں کی جو تمنّا ہے (موجودہ اور مروّجہ مذہب و تصوّف سے ہٹ کر) کیا وہ صدرِ اوّل کے اسلام اور ضابطۂ خداوندی یعنی وحی پر مبنی قرآن کی مستقل اقدار سے پوری ہو سکتی ہے۔ بہرحال اب آیئے تھوڑا سا تجزیہ تیسرے اور آخری رکن تصوّف کا بھی کر لیتے ہیں۔ پہلے یہ دیکھنا ہے کہ پوری دنیا کی قومیں اور محنت کش طبقے جب تصوّف کو اپنی عالمی تحریک کا منشور بناتے ہیں تو اس سے مراد کوئی خاص مذہب نہیں لیا جا سکتا۔ ظاہر ہے۔ یہاں کوئی بین الاقوامی مفہوم ہی ہوگا۔ تصوّف کی آج تک کوئی جامع تعریف تو سامنے نہیں آئی البتہ مذہبی بزرگ ہستیوں کو کشف و الہام کے ذریعہ خدا سے جو براہِ راست علم ہوتا ہے اسے اصطلاحاً تصوّف کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ انسان کا خدا سے براہِ راست مکالمہ اور نفسِ انسانی کا خدا کے ساتھ مل جانا تصوّف کے دو بنیادی عناصر ہیں۔ اس اعتبار سے تصوّف بحیثیت ایک مذہب کے یکسر شخصی یا ذاتی ہوتا ہے اور اس کے تجارب عقل و بصیرت کے بغیر ایسے ذریعہ سے حاصل ہوتے ہیں جو حواس اور نگاہوں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ اِسے باطنی ذریعۂ علم کہتے ہیں۔ ضمناً (MYSTICISM) اصل کے اعتبار سے یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی آنکھیں بند کر لینا کے ہیں۔ مختصر طور پر تصوّف کے لزوم و خصائص حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) خدا اور بندے کے درمیان براہِ راست تعلّق (۲) یقینی علم صرف باطنی علم ہے جو باقی تمام علوم سے افضل ہے (۳) اس محسوس کائنات کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ محض وہم اور فریب ہے۔ وجودِ حقیقی صرف خدا کا ہے ــــ (۴) انسانی زندگی کا منتہیٰ نفسِ انسانی کا حقیقتِ کُلّی میں جذب ہو جانا ہے۔ اس لئے تصوّف یکسر انفرادی اور داخلی کیفیت کا نام ہے (۵) دنیاوی اور مادی الائشوں سے دور رہ کر روحانی ترقّی ہو جاتی ہے۔

تصوّف کے متعلّق جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے میرے خیال میں اس سے کوئی ایسی بات اخذ نہیں ہوتی جو عالمی امن یا نظامِ سرمایہ داری سے بچاؤ کے لئے مددگار ہو سکے۔ ایک بے چارہ صوفی اپنی خانقاہ سے نکل کر امن کی تبلیغ تو کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے پاس ایک مہیب جنگ کو ٹالنے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ وہ مظلوم سے ہمدردی تو رکھے گا۔ لیکن ظالم کا پنجہ مروڑنے کی سکت نہیں رکھتا۔ پچھلی عالمگیر جنگوں کو نہ کوئی سینٹ پال روک سکا اور نہ کسی پروہت یا صوفی کی کرامت کام آئی۔ تصوّف ایک انفرادی تصوّرِ حیات ہے کسی عالمگیر نظامِ حیات کا نام

نہیں جو سرمایہ داری کے عفریت کا مقابلہ کر سکتا ہو۔ انقلابِ روس کے وقت تصوّف اور رہبانیت (عیسائیت) سے مایوس انسان نے اشتراکی نظام کی پناہ تلاش کی۔ وہ نظام ختم ہو گیا۔ ہماری خوش فہمی کی انتہا ملاحظہ فرمائیں کہ اب ہم پھر اسی سوراخ میں انگلی ڈال رہے ہیں۔ تصوّف کی سب سے بڑی دولت باطنی علم ہے جو انسانی مشاہدے اور علم و بصیرت سے ماورا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ہوائی جہازوں یا ٹینکوں کی یلغار کو تصوّف کی پھونکوں سے روکنا چاہتے ہیں اور یہ فرار کی راہ ہے۔ آنکھیں بند کر لینے سے خطرات نہیں ٹلا کرتے۔ موت سامنے نظر آئے تو خیالی مسیحا یاد آتا ہے۔ ڈوبتے ہیں تو تنکے کا سہارا لیتے ہیں۔ بہرحال سوشلزم ہو یا جمہوریت تصوّف سمیت یہ انسانوں کے خود ساختہ طریقے ہیں اور اگر علیحدہ علیحدہ اِن کے نتائج خوش کُن نہیں ہیں تو اِن کے ملغوبہ سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لہٰذا جو گائیڈ لائن پاکستان اور نئے عالمی نظام کے حوالہ سے ہمیں مل رہی ہے۔ وہ ہمارے مخصوص حالات کے تحت حوصلہ افزا نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ رانا صاحب کا تعلّق موجودہ نوجوان اور تعلیم یافتہ پود سے ہے۔ جسے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت دو قومی نظریہ اور اس کے مقاصد سے دُور یا بے خبر رکھا جا رہا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ پاکستان کے حوالہ سے دیگر ازموں اور مانگے کے اصولوں کی بات نہ کرتے اور بات صرف بات کرنے تک محدود نہیں، وہ ان خود ساختہ طور طریقوں کے اس قدر گرویدہ ہیں کہ اپنے کالموں میں بار بار انہیں جگہ دے رہے ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے دو ہفتے بعد یکم فروری کے سیاسی ایڈیشن میں "اللہ خیر کرے کے عنوان سے" اسی بین الاقوامی تحریک کے حوالہ سے دوبارہ تصوّف اور کارل مارکس کے راگ الاپ رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں اس کا اقتباس:

> "امریکہ اور یورپ دنیا کے بدترین اور انسان دشمن سرمایہ داری نظام کو چلانے والی سامراجی طاقتیں ہیں۔ ان کے خلاف اگر حق و انصاف کی جنگ لڑنی ہو تو ان سامراجی طاقتوں کے اندر بسنے والے محنت کش عوام کی تحریک کو بھی اپنے ساتھ ملانا پڑے اور تیسری دنیا کے تمام ممالک کے محنت کشوں کو بھی ساتھ ملانا پڑے گا۔ تمام دنیا کے محنت کشوں کو اگر ساتھ ملانا ہو تو خود بھی عوامی جمہوری انقلاب کا ایک منشور بنانا پڑے گا جس میں مادھو لعل، شاہ حسین، وارث شاہ، لطیف بھٹائی سے لے کر گوتم بدھ، بھگت کبیر اور حضرت شیخ محی الدین ابنِ عربی جیسے صوفیا کے نظریات کو بنیاد بنایا جائے اور اس کے ساتھ ہی ژاں پال سارتر اور کارل مارکس جیسے فلاسفروں کے فلسفے سے بھی مدد لی جائے اور ان کے ساتھ ہی فرانز فینن جیسے دانشوروں اور کافکا جیسے ادیبوں کے ادب کو بھی ملایا جائے ذوالفقار علی بھٹو اور بے نظیر بھٹو نے سوشلزم اور دینِ اسلام کا جو بنیادی منشور دیا ہے۔ اس کو بھی ساتھ ملایا جائے اور یوں ایک بین الاقوامی تحریک چلائی جائے۔"

اقتباس کا مطلب صاف ہے۔ کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ رانا صاحب اِن بھان متی کے تراشوں سے اگر ایک نیا دینِ الٰہی ایجاد کرنا چاہتے ہیں تو اُن کی خوشی۔ اس میں قومی مفاد والی کوئی بات نہیں۔ ہر قوم کی اپنی ایک شناخت ہوتی ہے جسے ترک کر کے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس سلسلہ میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ دین اسلام کے مقابلہ میں مروجہ مذہب (بنیاد پرستی) اور تصوف ایک ہی پلڑے میں نظر آتے ہیں۔

تمدن، تصوف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام

تصوف جو اقبالؒ کے الفاظ میں "اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے" کو اسلامی کہنا اگر فریب دہی نہیں، تو خود فریبی ضرور ہے۔ دراصل تصوف کی (INSTITUTION) ہی سرے سے غیر اسلامی ہے۔ تصوف کہتا ہے اس عالمِ رنگ و بو کی کوئی حقیقت نہیں۔ مادہ کا وجود باطل اور فریبِ تخیل ہے۔ اسلام کہتا ہے۔ خدا نے اس کائنات کو باطل نہیں۔ بلکہ بالحق اور بامقصد پیدا کیا ہے۔ تصوف کے قانون کے مطابق یہ دنیا مردار اور ناپاک ہے۔ اس کی ہر شے قابلِ نفرت ہے۔ خدا کہتا ہے کہ کائنات کی ان تمام چیزوں کو ہم نے انسانوں کے لئے باعثِ زیب و زینت بنایا ہے۔ تصوف ایک ذاتی مشاہدہ ہے لیکن اسلام ایک عالمگیر نظامِ حیات ہے۔ رہبانیت اور ترکِ دنیا تصوف کی زبان میں ذریعۂ نجات ہے اس کے برعکس اسلام اِس مسلک کو خود ساختہ قرار دے کر اپنی لاتعلقی کا اعلان کرتا ہے۔ اسلام ختمِ نبوت کے ذریعہ وحی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیتا ہے۔ لیکن تصوف اسے کشف و الہام کے پردے میں جاری رکھتا ہے۔ مشہور صوفی بزرگ محی الدین ابنِ عربی جن کا حوالہ زبیر رانا صاحب نے اپنے مقالہ میں دیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب فصوص الحکم میں لکھتے ہیں۔ "جس مقام سے نبی لیتے ہیں اُسی مقام سے انسانِ کامل لیتے ہیں۔" اسی کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں۔ "جہاں تک مجھے معلوم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔" (اقبال نامہ جلد اوّل صـ۴۴)

تصوف کے متعلق ان اضافی اشارات کی ضرورت اس لئے پڑی کہ ذرائع ابلاغِ عامہ اور ہماری گورنمنٹ کا اوڑھنا بچھونا آجکل تصوف ہی بنا ہوا ہے۔ مزاروں پر چادریں چڑھانا ہمارے راہ نماؤں کے لئے ایک اہم قومی فریضہ بن گیا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی، اور قومی اخبارات میں تصوف کو بطورِ خاص اہمیت دی جا رہی ہے۔ عالمِ اسلام کے تمام مسائل کا حل تصوف کے اتباع میں بتایا جا رہا ہے اور اس پر اصرار و تکرار اِس حد تک بڑھ گیا ہے کہ دین اسلام اور اس کا ضابطۂ حیات (قرآن) پسِ پردہ چلے گئے ہیں۔ عارفانہ کلام کی یلغار اگر کانوں میں رس گھولتی ہے تو شاہ حسین اور بلھے شاہ کی کافیاں ہمارے لئے عبادت بن گئی ہیں اور تصوف کا یہ خود تراشیدہ بُت اس سراپا عمل قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا رہا ہے۔

سکھ شبد کیرتن کرتے ہیں، عیسائی گیت گاتے ہیں، ہندو اپنے بھجنوں کا راگ الاپتے ہیں اور ہم اس تصوف

کی طفیل عیسائیوں اور ہندوؤں کی طرح طبلے کی تھاپ اور ہارمونیم کے سُروں پر کلمہ اور قرآنی آیات گا گا کر سر دُھنتے ہیں۔ ہمارے قوال جب ڈھولک کی تھاپ پر محمدؐ کا نام لیتے ہیں تو یقین کریں دُکھ سے کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ آخر مشرکوں، بت پرستوں اور توحید کے علمبرداروں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق اس فرق کو مٹایا جا رہا ہے۔ یہ لوگ شاید ہندو تصوّف کے پرچارک شنکر اچاریہ کی پیروی میں ایک اور بھگتی تحریک چلانا چاہتے ہیں تاکہ ہندو دھرم کو اسلام کے برابر لے آئیں۔ اس کے لئے وحدت الوجود کا عقیدہ بڑا مؤثر حربہ ہے جس میں رام اور رحیم دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ بھگت سورداس اور بھگت کبیر کے عقیدت مند اس عقیدہ کو عام کر رہے ہیں کہ رام بھی وہی اور رحیم بھی وہی اس لئے اسلام اور کفر میں کوئی فرق نہیں۔ بھگت کبیر کے الفاظ میں:۔

گنگا ایک گھاٹ بہتیرے کہت کبیر عقل کے پھیرے

یاد رہے کہ تصوّف علم و بصیرت کے ظاہری مطلب کا قائل نہیں۔ تصوّف نے تو باطنی معانی کے اعتبار سے قرآنِ کریم کی تفسیریں لکھ ڈالی ہیں اور خدا کی اس کتاب کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ یکم فروری کے سیاسی ایڈیشن میں جناب زبیر رانا نے کارل مارکس اور مہاتما بدھ کے فلسفہ سے بھی مستفید ہونے کا مشورہ دیا ہے۔ مہاتما بدھ ایک عظیم شخصیت کا مالک تھا جس نے دنیا کی ایک کثیر آبادی کو متاثر کیا۔ وہ ایک وسیع سلطنت کا حکمران تھا۔ انسانیت کے لئے اگر کچھ کرنے کے قابل ہوتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے دُکھیا انسانوں کو تڑپتا چھوڑ کر اس نے سادھوؤں اور صوفیوں کی طرح فرار کی راہ اختیار کی۔ ہمارے لئے سوائے ترکِ دنیا کے اس کے فلسفہ میں کچھ نہیں۔ باقی رہا مارکس تو اس کے فلسفہ کا عام فہم الفاظ میں خلاصہ کچھ یوں ہے۔ (۱) زندگی صرف اس طبعی زندگی کا نام ہے جو موت کے بعد ختم ہو جاتی ہے (۲) کائنات (جو کسی طریقہ سے خود ہی تخلیق میں آ گئی تھی) میں تغیّر کا عمل مسلسل جاری ہے۔ یہاں مکینکل طریقہ سے ہر شے تغیّر پذیر ہے۔ (۳) دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد ایک اور نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ پھر اس نظام کی جگہ ایک اور نظام لے لیتا ہے جو اس کی بھی ضد ہوتا ہے یہ سلسلۂ تغیّرات و اضداد ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ (۴) اس وقت نظامِ سرمایہ داری رائج ہے اب وقت آ گیا ہے کہ اس کی جگہ ایک اور نظام لے لے جو اس کی ضد ہو۔ یہ نظام اشتراکیت پر مبنی ہوگا۔ مارکس نے نوعِ انسان کی مالی مشکلات کے لئے ایک معاشی نظام بھی پیش کیا تھا۔ جس کے مطابق (۱) ذرائع پیداوار ذاتی ملکیت کے بجائے معاشرہ کی مشترکہ تحویل میں رہیں۔ (۲) جس میں ہر فرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق جان مار کر محنت کرے اور ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق ملتا جائے۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ مارکس کے اس معاشی فارمولا کی شقِ اوّل پر ہی عمل ہو سکا اور وہ بھی جبر اور خونی انقلاب کے ذریعہ یعنی ذرائع رزق مالکوں سے چھین کر اسٹیٹ کو دے دیئے۔ اس عمل کو آپ سوشلزم کہہ لیں یا کچھ اور لیکن دوسری

شق پر عمل کی نوبت نہ آئی اور یہ نظام باطل ثابت ہو گیا۔ غور طلب یہ ہے کہ اس میں ہمارے لئے تقلید کا باعث کیا بات ہوئی۔ سوائے اس کے کہ طاقت اور خون خرابے کے بعد ہم بھی سب کچھ قومی تحویل میں لے لیں۔ اس کے بعد دوسری شق پر عمل درآمد کیسے ہوگا اور وہ جذبۂ محرکہ جو ہمیں پوری رضامندی اور خوشدلی سے عمل پر آمادہ کر سکے کہاں سے آئے گا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہمارا بھی وہی حشر ہوگا جو سویٹ یونین کا ہوا ہے۔ یہ تو ہوئی سوشلزم کی بات لیکن ایسا جذبہ پیدا کرنا نہ مروجہ مذہب کے بس کی بات ہے اور نہ تصوف کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ تو آخر ہمارے محترم زبیر رانا صاحب کے ذہن میں وہ کون سا نظام ہے جو بقول اُن کے تصوف، جمہوریت اور سوشلزم کے اتحاد سے وجود میں آجائے گا۔ مشہور مغربی دانشور اوسپنسکی کہتا ہے کہ

"جن باتوں کو انسانی عقل اچھا سمجھتی ہے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے اس مجموعہ کا نام مذہب رکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

اسلام کے مطابق حق، حق ہے خواہ اس کے حق میں ایک بھی آواز نہ اُٹھے۔ کوئی بات اگر حق نہیں تو پھر وہ باطل ہے۔ یا پھر حق کے ساتھ باطل کی ملاوٹ کر دی جائے تو حق قائم نہیں رہتا۔ سب کچھ باطل ہو جاتا ہے۔ ہم اسلام کے علمبردار ہیں جسے دینِ حق کہہ کر پکارا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا نے اس دین کو ہر لحاظ سے مکمل قرار دے دیا ہے۔ یعنی اس میں کسی قسم کی کوئی ایسی کمی نہیں جسے دوسروں سے مستعار لے کر دُور کیا جائے۔ دوسرے ہم اپنے اصولوں کو قربان کر کے دیگر ازموں سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ کفار نے جب سرورِ کائناتؐ سے کہا کہ اس قرآن میں کچھ تبدیلی کر لو اور اس میں کچھ ہمارے اصول بھی شامل کر لو تاکہ کوئی مفاہمت ہو جائے، تو اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اے رسولؐ! اب وقت آگیا ہے کہ ان کفار سے دو ٹوک بات کر لی جائے۔ لہٰذا ان سے برملا کہہ دے کہ تمہارے معبود الگ، میرا معبود الگ۔ تم 'عبادت' سے کچھ اور مفہوم لیتے ہو میں کچھ اور۔ تمہارا اور ہمارا اختلاف اٹمٹ ہے۔ یہ کوئی ہنگامی اور وقتی نہیں۔ تم کو تمہاری راہ اور مجھ کو میری راہ۔ اس میں مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

باطل دوئی پرست ہے حق لاشریک ہے شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

مقامِ افسوس ہے کہ آج علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے پاکستان میں کارل مارکس کا فلسفہ دہرایا جا رہا ہے۔ کبھی مغربی جمہوریت اور تصوف کی کھچڑی پکتی ہے۔ گویا یہ مملکت کسی نظریہ یا مقصد کے تحت قائم نہیں ہوئی تھی۔ محض ایک جغرافیائی تقسیم تھی جسے ہندو کی تنگ نظری کے سبب مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مفاد کے لئے قائدِ اعظمؒ نے قبول کر لیا تھا۔ بعض کٹر مخالفین یہاں تک بھی کہتے سُنے گئے کہ نہیں صاحب یہ تو ہندو مسلمانوں کو لڑانے کے لئے انگریزوں کی ایک چال تھی۔ بہرحال یہ سب افسانے ہیں اور مخالفین کے پروپیگنڈا کا ایک حصّہ۔ دراصل پاکستان کا مطالبہ ہمارے دین کا تقاضا تھا۔ اسلام ایک مذہب نہیں، دین (نظام) ہے اور دین کا تقاضا ہے کہ اس کے لئے ایک خطۂ زمین

ہو جس میں اِس کا نفاذ ہو سکے۔ اس نظریۂ پاکستان کی بنیاد دو قومی نظریہ پر تھی جو کسی فرد کی اختراع نہیں بلکہ قرآنی معیارِ قومیت ہے۔ جس کا اشارہ سورۂ تغابن کی دوسری آیت میں موجود ہے۔ فرمایا۔

"اللہ وہ ہے جس نے تم سب انسانوں کو پیدا کیا۔ سو تم میں سے ایک گروہ کافروں کا ہے اور دوسرا گروہ مومنوں کا ہے۔" (۶۴/۲)۔

یہ نظریہ اسلام میں اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی نظریہ کو اجاگر کیا اور اسی کو لے کر قائداعظمؒ تحریکِ پاکستان کے لئے میدان میں نکلے۔ دنیا جانتی ہے کہ اس مردِ مجاہد نے انگریزوں، ہندوؤں اور خود نیشنلسٹ مسلمانوں کو اس نظریہ کا نہ صرف معترف کیا بلکہ وہ مملکت بھی حاصل کر لی جس میں قانونِ خداوندی (قرآن) کا نفاذ ہونا تھا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈ کالج پشاور میں دو قومی نظریہ کا یہ مبلغ (قائداعظمؒ) یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں بلکہ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔"

۱۹۴۱ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا:۔

"مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا اس کے نظریات یا ملّی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔"

ایک پنجابی اکھان ہے کہ "امب انار رکھ دیاں ہویاں لسوڑیاں نوں کون پچھدا اے"۔ ہمارے طرزِ عمل پر یہ کہاوت سو فیصد فٹ آتی ہے۔ ہمارا اسلام ایک مکمل اور عالمگیر نظامِ حیات ہے۔ قرآن جیسا غیر متبدل، محفوظ اور اپنی اصلی شکل میں ضابطہ ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا رسولؐ خاتم المرسلین بنی نوع انسان کے لئے ایک کامل نمونہ (اسوہ حسنہ) ایمان و عمل کا پیکر جس نے دین کو عملی شکل میں نافذ کر کے عرب کے ریگستان میں اسلامی مملکت اور اسلامی معاشرہ کی بنیاد رکھی۔ قیصر و کسریٰ کی تہذیب سرنگوں ہو گئی۔ حاکم و محکوم کا فرق مٹ گیا۔ یہ ایک ایسا دور تھا جب زیورات سے لدی ہوئی عورت یمن و شام کا تنہا سفر کر سکتی تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کے سامنے صدرِ اوّل کے اس دور نے ایسی ایسی محیّر العقول مثالیں قائم کیں کہ اس کے بعد آج تک ان کی نظیر نہیں مل سکی۔ یہ کوئی کاغذی باتیں نہیں ہیں۔ جہان والے اس نظام کو ایک عملی اور مشہود شکل میں دیکھ چکے ہیں۔ اِن حقائق کے پیشِ نظر ہماری یہ کاوش حیران بلکہ مضحکہ خیز

معلوم ہوتی ہے کہ ہم اپنا یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کارل مارکس کے فلسفہ یا دیگر خود ساختہ ازموں کو ذریعۂ نجات سمجھ لیں۔ دیکھئے ہم مسلمان ہیں آج سے نصف صدی قبل ہم نے اپنے خدا سے اسلام کے نام پر ایک ملک مانگا تھا۔ اس عہد کے ساتھ کہ ہم اُس میں ضابطۂ خداوندی (قرآن) نافذ کریں گے۔ ہم اس عہد پر پورا نہ اُتر سکے اور خدا کے حضور وعدہ خلافی کے مرتکب ہو گئے۔ مکافاتِ عمل نے ہمیں جھنجھوڑا اور آدھا ملک ہم سے چھن گیا۔ باقی جو بچ گیا ہے اس کے متعلق اگر لکھنے بیٹھوں تو بات لمبی ہو جائے گی۔ ہم ہیں کہ اب بھی قرآن و اسلام چھوڑ کر کمیونزم اور سوشلزم کے فلسفوں پر آس لگائے بیٹھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی وقت ہے کہ اس قسم کے سرابوں سے نکل کر حقائق کا سامنا کریں اور ان پٹے ہوئے مہروں کو چھوڑ کر کتاب اللہ کی طرف رجوع کریں جہاں ہماری راہ نمائی کے لئے سب کچھ موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہی نظریۂ حیات، وہی اصولِ زندگی، وہی نظامِ معاشرہ دنیا میں باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ یعنی ایک تو وہ نفع رساں اور منفعت بخش ہو اور دوسرے یہ کہ اس کی منفعت بخشی کسی خاص گروہ، خاص پارٹی، خاص ملک، خاص قوم تک محدود نہ ہو بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے نفع رساں ہو (۱۳/۱۷)۔ یہ ہے وہ عالمگیر اصول جس کی بنیادوں پر قرآن اپنا نظامِ زندگی استوار کرتا ہے۔ اور یہی اصول ہماری اور سب کی زندگی کا حقیقی ضامن بن سکتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایسے نظامِ زندگی کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں ہے اور بانیٔ پاکستان یہاں سوشلزم یا سیکولر نظام نافذ کرنا چاہتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ موجودہ نوجوان نسل کا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جبکہ یہ حقیقت ریکارڈ پر موجود ہے اور جب کبھی پاکستان کی کوئی جامع اور معتبر تاریخ مرتب ہوئی کوئی مؤرخ اسے نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ اصل صورت حال کیا ہے۔ پاکستان کے آئین اور طریقِ حکومت کے حوالہ سے قائدِ اعظمؒ سے زیادہ معتبر ہستی اور کون سی ہے جو اس غلط فہمی کو دُور کر سکتی ہے۔ تو آیئے دیکھتے ہیں کہ اُن کے تصور میں یہ مجوزہ نظامِ مملکت اور آئینی خط و خال کیسے تھے۔ امید ہے اس سے مملکتِ پاکستان کے حصول کا منشا و مقصود بھی پوری طرح واضح ہو جائے گا۔

۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظمؒ حیدر آباد (دکن) تشریف لے گئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبار نے ان سے سوال کیا کہ اسلامی مملکت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ جواباً قائدِ اعظمؒ نے فرمایا کہ:۔

> "اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے۔ جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور

حکمرانی کے لئے لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔" (اورینٹ پریس کی رپورٹ ۱۹۴۱ء)

فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان کے آئین کے متعلق اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈ کاسٹ کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا

"پاکستان کی کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہوگی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا آئین ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ اُن کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہے یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی۔ جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ بزعمِ خویش خدائی مشن پورا کریں۔"

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے کراچی میں افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا۔ بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔"

آگے چل کر وہ مقصد بھی خود ہی بتا دیا:

"ایسی مملکت جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر رو بہ عمل لائے جا سکیں۔"

تحریکِ پاکستان سے واقف لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ اُس وقت بھی مسلمان مختلف فرقوں اور پارٹیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ موجودہ دَور کی طرح نسلی، لسانی اور صوبائی تعصب زوروں پر تھا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہ اختلافات کے باوجود وہ کون سی قدرِ مشترک تھی جو ان متصادعناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی۔ مسلم کے سالانہ اجلاس (۱۹۴۳ء واقع کراچی) میں بانیٔ پاکستان نے پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ:۔

"وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے والے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس امّت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔"

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

"وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خدا کی کتابِ عظیم قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔ ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب، فلہٰذا ایک اُمّت۔"

یومِ قائداعظمؒ کے موقع پر اظہارِ عقیدت کے طور پر کئی کئی صفحے سیاہ کرنے والے صحافی اور قائد کے ساتھی ہونے کے دعویدار راہ نمایانِ قوم اچھی طرح سے جانتے ہوں گے کہ مغرب کی اعلیٰ تعلیم سے مزیّن ہونے والا یہ عظیم بیرسٹر قرآنِ کریم کو کیا سمجھتا تھا اور وہ اس کی عظمت اور جامعیت سے کس حد تک متاثر تھا۔ خود انہی کی زبانی سنیئے۔ ۱۹۴۵ء میں عید کی تقریبِ سعید پر قوم کے نام اپنے پیغام میں فرماتے ہیں:۔

"اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین مذہبی اور اخلاقی حدود تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے رسول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور یہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔"

"اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ اخلاق ہے جو مذہب، تجارت، عدالت، فوج، رسول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی، اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا، ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔"

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

اسلام کی مثلث نظامِ حیات (دین) ضابطۂ خداوندی (قرآن) اور آزاد مملکت (پاکستان) پر مشتمل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اس وقت اسلام بطور دین، دنیا کے کسی خطّے میں نافذ نہیں جسے ہم بطور نمونہ سامنے رکھ سکیں۔ علامہ اقبالؒ نے تجدیدِ اسلام کے لئے آزاد مملکت کا تصور دیا۔ اِسے آپ اُن کا اجتہاد کہہ لیں۔ قائداعظمؒ نے اُس تصور کو عملی جامہ پہنا کر پاکستان بنا دیا۔ تجدیدِ دین کے لئے یہ ان کا جہاد ہے۔ اب ہمیں بنیاد (آزاد مملکت) مل گئی۔ اس کے بعد اسلامی مثلث کی تکمیل کے لئے کرنے کا کام یہ تھا کہ ضابطۂ خداوندی کے ذریعہ نظامِ حیات نافذ کرتے اور صدرِ اوّل کے اسلام کی جھلک دنیا کو اک بار پھر دکھا دیتے۔

لیکن ہم ٹریک سے اُتر گئے اور ایسے اُترے کہ ۴۵ سال گزر گئے ہمیں راستہ ہی نہیں ملتا۔ کبھی سوشلزم کی طرف

دیکھتے ہیں اور کبھی تصوّف یاد آجاتا ہے۔ کبھی ان سب کو ملا ایک "پیوندی گدڑی" تیار کرنے لگ جاتے ہیں نیشنلسٹ علمائے کرام جنہوں نے قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی یہاں ڈیرے ڈال لئے تھے۔ اپنے اپنے مطلب کا اسلام پیش کر رہے ہیں برسرِ اقتدار طبقہ اپنی پارٹی کے ساتھ 'اسلامی' کا لفظ لگا کر گذارہ کر لیتا ہے اور جب کبھی کرسی ڈانواں ڈول ہوئی 'اسلام خطرے میں' کا سائرن بجا دیا۔

یہ بڑے دکھ کی باتیں ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک اسلام کو اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے حقیقی نفاذ کے لئے کوئی بھی مخلص نہیں ہے۔ بڑے بڑے جاگیردار، سرمایہ دار، صنعت کار، سیاسی وڈیرے اور خاندانی حکمران مُلّا کے اسلام (ہتھیار کی طرح) کی بات کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اسلام سے ڈرتے ہیں اور حبنا کتاب اللہ کے دین سے خوف کھاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ قرآن انسانوں پر دوسرے انسانوں کی بالادستی کبھی برداشت نہیں کرتا۔

چیست قرآں ؟ خواجۂ پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

پچھلے دنوں اسی عالمی نظام کے موضوع پر اور بھی بہت سے دانشور صحافیوں اور سیاسی سیانوں نے پاکستان کے حوالہ سے مختلف قومی جریدوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ ہمیں اپنی جغرافیائی حیثیت کو بہتر طریقے پر استعمال کرتے ہوئے خارجہ پالیسی کو نئے سرے سے نئے دَور کے تقاضوں کے مطابق ترتیب دینا چاہیئے۔ ترقی یافتہ یورپی ممالک میں دولتِ مشترکہ کا خیال پروان چڑھ رہا ہے جس میں مشترکہ تجارتی مفاد، بلاویزا سفری سہولتیں، مشترکہ کرنسی اور دفاع سب شامل ہیں۔ بالکل انہی بنیادوں پر ہمیں بھی اسلامی دولتِ مشترکہ کے تحت اپنے مشترکہ مفادات اور معاشی اتحاد کا نظریہ آگے بڑھانا چاہیئے۔ ایک طبقہ وزیرِ اعظم کے ۵ نکاتی فارمولا کو ذریعہ نجات بتاتا ہے اور کمزور اور چھوٹے ممالک کے اتحاد کے ذریعہ امریکہ کے نئے عالمی نظام کے مقابلے کی رائے دے رہا ہے۔ وزیرِ خارجہ چین کا کہنا ہے کہ نئے عالمی نظام کو چاہیئے کہ ہر ملک کے اس حق کو تسلیم کرے کہ وہ معاشرتی نظام، نظریات اور اقتصادیات میں اپنے قومی حالات کے پیشِ نظر کسی بھی نظام کے انتخاب میں آزاد ہے۔ غرضیکہ جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ ان سب کی حیثیت ایک مشورہ کی ہے۔ بات گاؤں کے چوہدری کی ہی چلے گی۔ عرب ممالک کے حصّے میں دو باتوں کی توقع ہے۔ تیل کی دولت سے محرومی اور اسرائیل کی بالادستی۔ چین اور دیگر مسلم ریاستوں کا کردار بھی امریکہ بہادر ہی متعین کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ اور اس کے حواری ممالک کے مفاد اور خوشحالی کا دارومدار تیسری دنیا کے ذرائع پیداوار پر ہے۔ شمالی ممالک جنوب کا استحصال کر کے ہی امیر رہ سکتے ہیں۔ یہ نفسا نفسی کا دَور ہے۔ کون کسی کے لئے اپنے مفاد قربان کرتا ہے۔ یہ سب ہماری خوش فہمیاں اور کاغذی باتیں ہیں۔ یہ ہونا چاہیئے وہ ہونا چاہیئے۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا کچھ قابلِ عمل اور ممکن ہے۔ اپنے ملک کو ہی لے لیجئے۔ اس کی اندرونی افراتفری اور خلفشار سے

ہ کوئی واقف ہے۔ اسلام کے نام پر حاصل ہونے والے اس ملک میں کون سی برائی ہے جو نہیں ہو رہی۔ قوم کے راہ نماؤں اور سیاستدانوں کا اصول یہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اقتدار حاصل کرو اور پھر راتوں رات سب کچھ سمیٹ لو۔ کوئی احتسابی عمل نہیں۔ کسی تنقید اور محاسبے کا خوف نہیں۔ حکومت اور حزبِ مخالف میں محاذ آرائی اور انتقامی عمل جاری ہے۔ بے یقینی کی اس کھینچا تانی میں کچھ پتہ نہیں کہ کل کیا ہوگا۔ اندازہ لگائیں کہ ان حالات میں ہم دیگر اسلامی ممالک اور عالمی تنظیموں سے باہمی مفاد کے لئے کیا روابط رکھ سکیں گے اور ہماری بات میں کتنا وزن ہوگا۔ ضروری ہے کہ ہم ملکی اور سیاسی حالات میں اعتدال کی راہ اختیار کریں۔ ہماری دشمنی اور دوستی جو کچھ بھی ہو اجتماعی مفاد اور قومی نقطہ نگاہ کے مطابق ہو۔ ہم مسلمان ہیں۔ ہمارا لائحہ عمل قرآن کریم اور اسوۂ حسنۂ رسولؐ ہے۔ اس سے ہٹ کر دنیا کا کوئی نظام یا ازم ہماری فلاح و بہبود، ترقی اور بقا کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ پچھلے دنوں ہمارے وزیرِ خزانہ کا بیان تو سب نے پڑھا ہوگا وہ یقیناً حوصلہ افزا نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم اور عباسیہ کی ٹھاٹھ باٹھ اور شاہانہ طور طریقے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ بابِ پاکستان کے افتتاح اور غیر ترقیاتی منصوبوں پر کروڑوں روپے پانی کی طرح بہا دئے جاتے ہیں۔ حکمرانوں اور عوامی نمائندوں کے آرام و آسائش پر بے دریغ خرچ ہوتا ہے۔ بڑے بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار قومی سرمایہ کو غیر ممالک میں اپنے علاج معالجہ پر اڑا رہے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں اور اس کے باوجود اگر ہمارے صدر صاحب کہیں کہ اسلام کی طرف ہماری پیش رفت بہت سست ہے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کا ذمہ دار کون ہے۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ قوموں میں خرابیوں کی ابتدا اوپر کے طبقہ سے شروع ہوتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں بھی ایسا ہی ہوا تھا اور اب بھی وہی آثار ہیں۔ بہرحال اسلامی پیش رفت کے لئے اتنی گذارش ہے کہ ہمارے وزیرِ اعظم اور صدر صاحب دونوں میں سے ایک بھی اگر حضرت عمرؓ بن جائے تو ایک دن میں اسلام آسکتا ہے۔ نہ یہ شریعت بلوں کا محتاج ہے اور نہ کسی آرڈی نینس کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے لئے ہمیں، قرآن، تغیرِ نفس کی تلقین کرتا ہے۔ اگر ہمارے حکمران اسلام کی روح کے مطابق اپنے لباس و خوراک، رہائش، ٹرانسپورٹ اور دیگر بنیادی ضرورتوں کے لحاظ سے عوامی معیار پر آئیں تو اسلام کے ساتھ ساتھ خود انحصاری بھی آجائے گی اور نئے عالمی نظام میں بھی اپنی قومی ذمہ داریوں سے نپٹ سکیں گے۔

اور آخر میں چند باتیں سرمایہ داری کے متعلق جس کے تدارک کے لئے ہم اپنے طور طریقے چھوڑ کر اغیار کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا مقصد ایک عادلانہ اسلامی معاشرے کا قیام ہے۔ لہٰذا امریکی سرمایہ داری سے قبل ہمیں اپنے ملک میں اس لعنت کے متعلق کچھ سوچنا چاہیئے۔ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ برائی سے زیادہ اس کے اسباب پر توجہ دیتا ہے تاکہ اس برائی کی نوبت ہی نہ آئے۔ پاکستان میں اس وقت نت نئے قارون پیدا ہو رہے ہیں اور دن بدن ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس مصیبت کے لئے ہمیں قرآن کا معاشی نظام آزمانا پڑیگا

اور اگر واقعی ہم نے یہ نظام اختیار کر لیا تو سمجھو ہم نے سب کچھ پا لیا۔ اسلام کے اس معاشی سسٹم کے چیدہ چیدہ خط و خال کچھ یوں بنتے ہیں۔

انسانی زندگی کا مدار زمین کی پیداوار پر ہے جس پر چند بڑے زمیندار اور جاگیردار قابض چلے آ رہے ہیں۔ وہ اپنی مقبوضہ زمین پر مزارعوں ہی سے نہیں، غلاموں سے بھی کام کراتے ہیں۔ قرآن نے آ کر یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ نہ ذرائع پیداوار پر افراد کی ملکیت ہو سکتی ہے نہ کسی انسان کے پاس اس کی ضروریات سے زائد دولت رہ سکتی ہے ــــ قُلِ الْعَفْوَ)۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین

اس سے ایک طرف غلامی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور دوسری طرف نظامِ سرمایہ داری کی بساط بھی اُلٹ جاتی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ نظام ممکن العمل بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ جب کہ اسلام نے دنیا کو ایسا معاشرہ متشکل کر کے دکھا دیا۔ ایسے معاشرہ میں ایک فرد اپنا مال و جان خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے اللہ اُسے جنّت دیتا ہے (۹/۱۱۱)۔ عملاً یہ معاملہ اسلامی مملکت کے ساتھ ہوتا ہے (۴۸/۱۰)۔ اس طرح ایک عبدِ مومن کا مال و جان انفرادی ملکیت کے بجائے اسلامی نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اُسے دنیا اور آخرت میں جنّتی زندگی مل جاتی ہے۔ لہٰذا اسلامی نظام میں مال پر انفرادی ملکیت کسی فرد کی نہیں رہتی وہ خدا کا مال ہو جاتا ہے (۲۴/۳۳)۔ اسلام میں کام کرنے اور کمانے کی صلاحیت اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں بلکہ خدا کی عنایت ہے۔ (۱۶/۷۱، ۱۶/۵۳)۔ نظامِ سرمایہ داری کا نمائندہ قارون کہتا ہے کہ میرا مال و دولت میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے (۲۸/۷۸)۔ میں اسے دوسروں کو کیوں دوں۔ قرآن کہتا ہے یہی ذہنیت سارے فتنہ کی جڑ ہے اور دنیا میں فساد کی موجب (۳۹/۴۹) ہے۔

تدبّر کی فسوں کاری سے قائم رہ نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدّن کی بنا سرمایہ داری ہے

اسلام نہ صرف سرمایہ داری بلکہ اس کے اسباب کا بھی قلع قمع کرتا ہے اور سرمایہ کے بجائے معاوضہ صرف محنت کا جائز سمجھتا ہے۔ رزق کی مساویانہ اور حسبِ ضرورت تقسیم اسلامی مملکت کا فریضہ ہے اور مومنین قرآن کی رُو سے اپنی ضروریات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ صدقہ، خیرات، وراثت اور قرضِ حسنہ وغیرہ کے احکام بھی جن کا تعلق زیادہ تر عبوری دور سے ہے، اسلام میں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بلا ضرورت یا ضرورت سے زائد خرچ کرنا منع ہے۔ قرآن میں سونے چاندی کے ارتکاز اور دولت جمع کر کے گنتے رہنے والوں کے لئے بڑی تہدید آئی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کچھ آتا تھا رات ہونے سے پہلے خرچ کر دیا کرتے تھے۔ حضورؐ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ انبیاءؑ کی جماعت کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑا

کرتی۔ یعنی اُن کے پاس جو کچھ ہوتا ہے ربوبیتِ عامہ کے لئے وقف ہوتا ہے، ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ حضورؐ نے ساری عمر نہ کچھ جمع ہونے دیا اور نہ کوئی ورثہ چھوڑا۔

سورۂ بقر میں ہے کہ اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے کہتے ہیں کہ ہم خدا کی راہ میں (نظامِ خداوندی کے لئے) کیا خرچ کریں۔ اِن سے کہہ دو کہ اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دو۔ اِس حکم سے کسی کے پاس فاضلہ دولت نہ رہی اور جب فاضلہ دولت نہ رہی تو معاشی ناہمواریاں اور سرمایہ داری کا خاتمہ ہوگیا۔ قرض خواہ اور مقروض، مالک مکان اور کرایہ دار، زمیندار اور کاشتکار، کارخانہ دار اور مزدور، غریب اور امیر کا تفاوت ختم ہوگیا اور یوں

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمودؐ و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز
بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

SUBSCRIPTION RATES FOR THE YEAR 1992

INLAND Rs. 120, FOREIGN Rs. 400 OR US $18
PLUS BANK CHARGES IF REMITTED BY CHEQUES DRAWN ON BANKS OTHER THAN LAHORE.

FOR DIRECT PAYMENT ALL REMITTANCES SHOULD BE IN THE NAME OF

IDARA TOLU-E-ISLAM
25 B, GULBERG II
LAHORE, PAKISTAN

THROUGH ACCOUNT NUMBER 3972-54/172 AT
HABIB BANK LIMITED
MAIN MARKET
GULBERG, LAHORE.

طلعت محمود

ہمارا معاشرہ

آج کی تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ اپنا پاکستانی معاشرہ ہر قسم کی معاشرتی اور سماجی برائیوں کا گڑھ بن چکا ہے۔ اس بارے میں ہمارے موجودہ وزیراعظم صاحب کا یہ کہنا ہے کہ یہاں "آوے کا آوا بگڑا ہوا ہے"۔ اس میں شک بھی کوئی نہیں کیونکہ ہمارے ہاں حالت یہ ہو چکی ہے کہ ڈاکٹر اور اساتذہ لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہیں۔ پولیس رشوت کی لعنت کا شکار ہے۔ حکومت کے اہلکاروں نے حکومت کے خزانے کو لوٹنا اپنا حق سمجھ رکھا ہے۔ تاجر حضرات ٹیکس چوری کر رہے ہیں۔ جعلی دوا ساز ادارے جعلی ادویات بنا کر لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ برائیاں وبائی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ اس بگڑی صورت حال کی نشان دہی اہلِ فکر و دانش کرتے تو ہیں لیکن خالی نشان دہی اس کا علاج نہیں۔

اصل ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ان تمام معاشرتی اور سماجی برائیوں کی وجہ معلوم کی جائے اور ان محرکات کا جائزہ لیا جائے جو افرادِ معاشرہ کو ایسی برائیوں کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمام برائیوں کی جڑ ہمارا موجودہ نظامِ حکومت ہے۔ اس کو بدلے بغیر ہماری حالت ایسے ہی رہے گی جیسے کہ ایک پیاسا دریا کے کنارے کھڑے ہو کر صرف اور صرف دعا ہی مانگتا رہے کہ یا اللہ میری پیاس بجھا دے۔ اس کی ایسی تمنا صرف الفاظ تک ہی محدود رہے گی، عملاً پوری نہ ہو سکے گی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ رائج الوقت نظامِ حکومت کیوں ہماری معاشرتی برائیوں کی جڑ ہے!

جیسا کہ ہم جانتے ہیں۔ موجودہ نظام وہ ہے جو یہاں انگریز نے اپنے دورِ حکومت میں قائم کیا تھا۔ اس میں وہ قوانین وضع کئے گئے جن کا مقصد اس قوم کو محکومیت و محتاجی میں گرفتار رکھنا تھا۔ یہاں کے لوگوں کا سماجی اور اخلاقی معیار بلند کرنا، ان کی معاشی حالت بہتر بنانا اور اچھے شہری بنانا اس کے پروگرام میں شامل ہی نہ تھا۔ برصغیر میں اپنا تسلط قائم کرنا اس کا مقصد تھا۔ اس کے لئے اس کے اپنے تقاضے تھے۔ جن کی بنا پر اس نے ایک محکوم قوم کے لئے ایک نظامِ حکومت وضع کر رکھا تھا۔ ایک فلاحی معاشرہ قائم کرنا اس کے منشور میں ہی نہ تھا۔ وہ سیاست اور ڈنڈے کے

زور پر حکومت کرتا تھا۔ اگر بظاہر اس نے کوئی رفاہِ عامہ اور خدمتِ خلق کے کوئی کام کیے بھی تو اس مجبوری کے تحت کہ اسے یہاں اپنی حاکمیت قائم رکھنا تھی اور تعلیم عام کرنے کے لئے اس نے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کیں تو اس لئے کہ اسے اس وسیع ملک کو چلانے کے لئے کلرکوں کی فوج درکار تھی۔ صرف سائنس لینے والے زندہ افراد کی اس کو ضرورت تھی۔ ایسے نظامِ حکومت میں ہر شخص اپنی اور اپنے متعلقین کی بقاء کے لئے جنگ لڑتا ہے۔ کوئی اس کو تحفظ فراہم نہیں کرتا۔ ایسے نظام میں ہر شخص اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ وہ ہر وقت اسی پریشانی میں مبتلا رہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیوی بچوں کا مستقبل کیا ہوگا۔ وہ ان کا مستقبل محفوظ کرنے کی خاطر ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کرتا ہے۔ رزقِ حلال کے مواقع اس کو کہیں نظر نہیں آتے۔ صرف اللہ پر بھروسہ کرنے کا درس اس پر کچھ اثر نہیں کرتا اور منبروں کے وعظ اُسے صرف ذہنی تفریح (عیاشی) مہیا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ رزقِ حلال کے مواقع خود اللہ تعالیٰ نے محسوس شکل میں آکر خود مہیا کرنے نہیں ہوتے۔ یہ تو صرف اس کے احکام کے مطابق متشکل نظام نے فراہم کرنے ہوتے ہیں۔ چنانچہ صرف قرآنی یا بہ الفاظِ دیگر اسلامی نظام ہی صرف ایسا نظام ہے جو ہر شخص کو معاشرتی سماجی تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔ صرف قرآنی نظام ہی میں نہ خوف ہوگا نہ حُزن کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ قرآنی نظام رائج کر کے دیکھ لیں۔ اس کے زندگی بخش نتائج آپ کے سامنے آتے چلے جائیں گے۔ آج بھی پاکستانی قوم کی اکثریت اسلام کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے مگر پہلے ان کو قرآنی قوانین کے مطابق اپنے گھروں میں تو عزت کا مقام دلوائیں جہاں وہ اپنے بیوی بچوں اور بوڑھے والدین کو روٹی بھی مہیا نہیں کر سکتے۔

اب یہاں ایک بہت اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ۴۴ سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک ہم پاکستان میں "اسلامی نظام" کیوں رائج نہیں کر سکے۔ جسے ہم نے بے شمار قربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ پاکستان میں نفاذِ اسلام کی راہ میں دیگر رکاوٹوں کے علاوہ سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے مختلف مذہبی فرقوں کا وجود ہے۔ قرآن حکیم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے اور شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں جماعتِ مومنین پر دیگر احسانات کا ذکر فرمایا، وہاں ایک بڑا احسان یہ بھی بتایا کہ تم ریت کے ذروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ تمہیں سیسہ پلائی دیوار کی طرح مضبوط بنا دیا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تمہیں آپس میں بھائی بھائی بنا دیا اور دل آپس میں جوڑ دیئے۔ یہ تھی مومنین کی کیفیت۔ پھر دورِ ملوکیت آیا اور دین مذہب میں تبدیل ہوا، تو مختلف فرقے وجود میں آگئے اور امتِ واحدہ مختلف فرقوں میں منقسم ہو گئی۔ ہر فرقے کے مذہبی پیشوا نے اپنے فرقے کے لوگوں کے مذہبی جذبات کو دوسرے فرقے کے لوگوں کے خلاف بھڑکایا اور کشت و خون کرایا اور اس خون کو اپنے اپنے فرقے کی آبیاری کے لئے کھاد کے طور پر استعمال کیا۔ یوں امتِ مسلمہ کی وحدت کا شیرازہ بکھر گیا۔ یہی کیفیت گذشتہ ہزار گیارہ سو سال سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ آج بھی ہر فرقے کا مذہبی پیشوا منبر پر کھڑے ہو کر دوسروں کو طعن کر رہا ہے۔

ایک دوسرے پر کفر و الحاد کے فتوے صادر کر رہا ہے۔ بھائی کو بھائی سے لڑا کر کشت و خون کرا رہا ہے۔ مذہب کے نام پر ملک کو میدانِ کارزار بنایا ہوا ہے۔ ہر فرقہ اپنے اپنے حلقے مضبوط کرنے میں مصروف ہے۔ ان کی مسجدیں الگ الگ ہیں۔ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنا ان کو گوارا نہیں۔ امتِ مسلمہ کا واحد مرکز خانہ کعبہ ہے اس کے متعلق بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ ہم تو امامِ کعبہ کے پیچھے بھی نماز ادا نہیں کرتے۔ ہر ایک کی الگ الگ سنت اور اپنی اپنی فقہ ہے۔ اگر ان سے پوچھا جائے کہ متفقہ علیہ شریعت کی کوئی کتاب تو دکھائیں جس کو نافذ کیا جا سکے تو ان کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔

اب تو اس مذہبی پیشوائیت نے مذہبی فرقہ بندی کو مزید مستحکم کرنے کے لئے قانونی تحفظ بھی حاصل کر لیا ہے کہ ہر فرقہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق شریعت کی تشریح کر سکتا ہے اور اس پر عمل کر سکتا ہے، اس اعتراض سے بچنے کے لئے کہ فرقہ بندی شرک ہے، 'مکاتبِ فکر' کی اصطلاح وضع کر لی گئی ہے۔ جس کی آڑ میں فرقہ بندی قائم و مستحکم ہے لیکن الفاظ کے بدل جانے سے حقیقت تو بدل نہیں جاتی۔ سنکھیا تو سنکھیا ہی رہتا ہے خواہ اس کا نام سمّ الفار کیوں نہ رکھ دیا جائے۔ ہر کوئی اپنے اپنے مکتبۂ فکر پر ڈٹا ہوا ہے اور کوئی بھی اس بات کا اعتراف کرنے کو تیار نہیں کہ اس فرقہ بندی نے ہی قوم کا شیرازہ بکھیرا ہوا ہے۔

ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ صرف وہی حق پر ہے اور دوسرے گمراہ۔ مگر حق تو صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے قرآنِ حکیم جس کا دعویٰ ہے کہ تم اس میں کوئی اختلافی بات نہیں پاؤ گے۔ قرآن تو یہ کہتا ہے اور ہم مسلمان ہونے کے دعویٰ دار اس فرمان کے علی الرغم بیسیوں فرقوں میں بٹے ہوئے دنیا کے سامنے کیا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے سمجھنے کی بات ہے۔

قرآن تو سورج کی طرح ایک روشن کتاب ہے جو خود بھی روشن ہے اور دنیا کو بھی روشنی فراہم کرتی ہے مگر جب آنکھوں پر مفاد پرستیوں کی سیاہ پٹی باندھ رکھی ہو، تو روشنی کہاں سے آئے گی۔ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے ہم سب کو نیک نیتی کے ساتھ قرآن کے گرد جمع ہونا پڑے گا۔ اپنی اپنی مفاد پرستیاں چھوڑ کر اپنی اپنی دکانیں بند کرنا پڑیں گی۔ ماضی پرستی چھوڑ کر حال میں آنا پڑے گا۔ افہام و تفہیم کے جذبے سے اجتہاد کے ذریعے جمود توڑنا پڑے گا، تو ہی اپنے پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو سکے گا۔ بصورتِ دیگر ہماری موجودہ روش سے یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا اور ہم معاشرتی اور سماجی برائیوں کا رونا روتے ہی رہیں گے۔ ہمارے منبروں کے وعظ صرف اور صرف ذہنی تفریح (ذہنی عیاشی) کا سامان مہیا کرنے تک محدود رہیں گے اور نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔

سعید احمد واصف

عقیدۂ ایصالِ ثواب

یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ بیشتر عجمی ممالک خصوصاً ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور ایران وغیرہ میں ایصالِ ثواب کی رسمیں بشکل قرآن خوانی، تیجہ، چہلم، برسی اور عرس وغیرہ عام ہیں اور دین کا اہم جزو اور مرنے والے کے لئے لازم تصور کی جاتی ہیں لیکن اس حقیقت سے بہت ہی کم لوگ واقف ہیں کہ ایصالِ ثواب کا عقیدہ اور اس سے متعلق تمام رسومات کا دینِ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس عقیدے سے قرآنِ پاک کا انکار لازم آتا ہے۔

یہ باطل عقیدہ ہندو، عیسائی، پارسی، یہود اور دیگر غیر مسلم اقوام کا زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے جس کو ہم عجمی مسلمانوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی یا نومسلم ہونے کے باعث مختصر تبدیلیوں کے ساتھ اپنا لیا اور اس کو اتنا بڑھاوا دیا کہ ایصالِ ثواب کی رسمیں تقریب دعوت اور جشن کا سماں پیش کرنے لگیں اور ان کو ثوابِ دارین حاصل کرنے کا ذریعہ بھی سمجھا جانے لگا۔ اس مرض کا شکار ہندو پاکستان اور اس علاقے کے لوگ ہیں جہاں جہاں ایرانیوں کا اثر رہا، عجمیوں کے ذریعہ اسلام پھیلا لیکن جن مقامات میں اسلام عربوں کے ذریعہ پھیلا۔ مثلاً سعودی عرب، یمن، شام، فلسطین اور مصر وغیرہ وہاں کے لوگ اس مرض سے محفوظ ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں قرآنِ حکیم کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ثواب ناقابلِ انتقال چیز ہے اور اسے کسی بھی حال میں مُردہ یا زندہ کے نام منتقل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قرآنِ کریم کی رُو سے ایک کا عمل دوسرے کے کام نہیں آسکتا۔

ارشادِ الٰہی ہے:۔

"اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے، اس سے پہلے پہلے خرچ کرلو کہ تم میں سے کسی کی موت آکھڑی ہو۔ پھر وہ کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں کیوں مہلت نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہوجاتا اور اللہ تعالیٰ کسی

شخص کو جب کہ اس کی میعاد آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا۔" (المنفقون، ۱۰-۱۱)

مذکورہ بالا آیت سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ مالی عبادت کا ثواب بھی اسی وقت ملے گا جب انسان اپنی زندگی میں خود اپنے ہاتھ سے خیرات کرے۔ کوئی دوسرا شخص اس کی طرف سے خیرات نہیں کر سکتا۔ اگر کر سکتا ہے، تو مرنے والے کو نزع کے وقت اتنی گھبراہٹ کیوں ہے۔ وہ اپنی اولاد و احباب سے کہہ سکتا ہے کہ میری طرف سے میرے مرنے کے بعد خیرات کر دینا لیکن اس کے لئے وہ خدا سے مہلت مانگتا ہے تاکہ اپنی زندگی میں اپنے ہاتھ سے خیرات کر سکے لیکن اس کو مہلت نہیں دی جاتی۔

پارۂ اوّل کے آخری رکوع میں اللہ تعالیٰ نے متعدد انبیاء کرام یعنی حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی اولاد کا ذکر کر کے فرمایا ہے:۔

"یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو گذر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آوے گا اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آوے گا اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی نہ ہوگی۔"

(البقرۃ - ۱۴۱)

یہ آیت اس رکوع میں دوبارہ آئی ہے اور واضح طور پر یہ ثابت کر رہی ہے کہ ان انبیاء کرامؑ کے اعمالِ خیر تمہارے ہرگز کام نہیں آسکتے اور نہ تمہارے اعمالِ خیر ان کے کام آسکتے ہیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ کسی کا عمل دوسرے کے کھاتے میں جمع کر دیا جائے کیونکہ لفظ کسب پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ جس کی کمائی ہے، جس نے محنت سے کام لیا ہے اور جس نے جتنی اور جس قسم کی مزدوری کی ہے۔ اس کی اُجرت اُسی کو ملے گی۔ مفسر قرطبی اپنی تصنیف "احکام القرآن" میں لکھتے ہیں:۔

"اور تمہارے لئے تمہارا کیا ہوا، خواہ وہ خیر ہو یا شر۔" (تفسیر قرطبی ص ۵۲۳)

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"یعنی جب انبیاء کرامؑ کو باوجود کہ وہ امت کے امام بھی ہیں اور ان سے افضل بھی ہیں جب انہیں ان کی کمائی کی جزا دی جائے گی، تو تم تو اس کے زیادہ لائق ہو۔" (ایضاً ص ۵۳۱)

یعنی کسب و کمائی اچھی بھی ہو سکتی ہے اور بُری بھی اور کسی کی کمائی دوسرے کے نامزد نہیں ہو سکتی۔ جب انبیاء کرامؑ کی محنت دوسرے کے نام نہیں کی جا سکتی، تو وہ لوگ جن کی انبیاء کرامؑ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں، ان کی کمائی کسی دوسرے کے کھاتے میں کیسے تحریر کی جا سکتی ہے۔

"بس تم کو تو اسی کی سزا مل رہی ہے جو کچھ تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔" (التحریم - ۷)

گویا اپنے ذاتی اعمال کے علاوہ کسی دوسرے کے اعمال کا کوئی معاوضہ نہ ملے گا اور ثواب و عذاب صرف اپنے ذاتی اعمال پر ہی منحصر ہیں۔ کسی دوسرے کے اعمال سے انسان کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

"تم کو ان ہی عملوں کی سزا دی جا رہی ہے جو تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔" (النمل ۔ ۹۰)

"اور ان کو وہی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے تھے۔" (الاعراف ۔ ۱۴۷)

مذکورہ بالا تین آیات کا سیاق و سباق یہ بیان کر رہا ہے کہ ان تینوں آیات کا تعلق کفار سے ہے اور اسی لئے مترجم مولانا اشرف علی تھانوی نے ترجمہ میں لفظ سزا اضافہ کیا ہے لیکن تمام فقہاء کے نزدیک قرآن کا ہر حکم عام ہوتا ہے۔ اسے کسی طبقہ کے ساتھ اس وقت تک مخصوص نہیں کیا جا سکتا جب تک خود قرآن میں اس کا مخصص کیا جانا مذکور نہ ہو اور عربی لحاظ سے لفظ جزا عام ہے جو جزا اور سزا دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ تصور کرتا ہے کہ چونکہ یہاں کفار اور ان کے گناہوں کی سزا کا ذکر ہے اس لئے اس حکم میں نیک اعمال داخل نہیں ہو سکتے، تو ان سے عرض ہے کہ ان کو سابقہ آیات میں ایسی متعدد آیات بھی مل جائیں گی جن میں اہل جنت کا ذکر کیا گیا ہے اور وہاں بھی شرط نافذ کی گئی ہے اور یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک جگہ شرط کو باقی رکھا جائے اور دوسری جگہ شرط کو باطل قرار دے دیا جائے کیونکہ اگر شرط کو باطل قرار دے دیا گیا، تو جنت اور اس کی نعمتیں مہمل شے قرار پائیں گی۔ اس لئے کہ یہ تو مسلمہ اصول ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ جب شرط کا وجود ختم ہو گا، تو مشروط خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس طرح جنت کا کوئی وجود باقی نہ رہے گا۔

"اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے اعمال کے سبب۔" (الانعام ۔ ۱۳۲)

اگر آپس میں ثواب بانٹا جا سکتا، تو کسی شخص کا درجہ اس کے عمل کے مطابق ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ایک دوزخی کو دوسرے کے ثواب سے جنت مل گئی، تو اس کا درجہ عمل کے مطابق کب رہا؟

"اور اعمال نامہ رکھ دیا جائے گا، تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ ہے اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی، اس نامۂ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ ہے قلمبند کئے ہوئے، نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا گناہ۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا، وہ سب (لکھا ہوا) موجود پائیں گے۔" (الکہف ۔ ۴۹)

اُس کتاب یعنی نامۂ اعمال سے کوئی چھوٹی یا بڑی چیز باقی نہ بچے گی لیکن اس کتاب میں صرف وہی امور تحریر ہوں گے جو انسان نے بذاتِ خود انجام دیئے ہوں۔ گویا نامۂ اعمال میں کسی عمل کی موجودگی کے لئے شرط یہ ہے کہ انسان نے اسے خود کیا ہو۔

"پھر ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا عوض ملے گا اور ان پر بالکل ظلم نہ ہو گا۔" (العمران ۔ ۱۶۱)

یعنی جزا و سزا اور ثواب و عتاب، یہ دونوں انسان کے ذاتی عمل پر موقوف ہیں۔

"اور تم کو اسی کا بدلہ ملے گا جو کچھ تم کیا کرتے تھے۔" (الصفت ۔ ۳۹)

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ انسان کو اپنے ذاتی عمل کے علاوہ کسی اور کے عمل کی جزا قطعاً نہ ملے گی۔

"اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی اور یہ کہ انسان کی سعی بہت جلد دیکھی جائے گی۔
پھر اس کو پورا بدلہ دیا جائے گا۔" (النجم ۔ ۳۹ تا ۴۱)

پہلی آیت میں یہ بیان کیا جا رہا ہے کہ انسان کو اپنی ذاتی سعی کے علاوہ کچھ نہ ملے گا اور چونکہ ایصالِ ثواب کی جتنی بھی صورتیں ہیں، ان کا مرنے والے کی سعی سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا ان چیزوں کا مرنے والے کو ہرگز اجر نہ ملے گا۔ دوسری آیت میں یہ وضاحت بھی کی جا رہی ہے کہ وہاں انسان کو صرف اپنی ہی سعی نظر آئے گی اور اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

"جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا اور اپنے بُرے کئے ہوئے کاموں کو بھی۔" (العمران ۔ ۳۰)

اس آیت میں عملِ خیر اور عملِ شر دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ انسان نے بذاتِ خود جو اعمال کئے ہیں، خواہ وہ خیر ہوں یا شر، انسان ان کو وہاں موجود پائے گا، یعنی ایصالِ ثواب کے نام سے جو چکر چلایا گیا ہے، تو یہ عمل چکر چلانے والے کے کھاتے میں تو بے شک نظر آئے گا لیکن جس مُردے کی خاطر یہ پاپڑ بیلے تھے۔ اس کے کھاتے میں اس عمل کا کوئی وجود نہ ہوگا کیونکہ جن افعال کا کسی کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، وہ اس کے حساب میں ہرگز درج نہ ہوں گے۔

"ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملے گا۔" (النحل ۔ ۱۱۱)

یہ آیت پُکار پُکار کر کہہ رہی ہے کہ اس روز ہر انسان کو اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہوگی اور وہاں جو بھی صلہ دیا جائے گا۔ اچھا یا بُرا، وہ ان کے اپنے ذاتی اعمال پر دیا جائے گا۔ دوسرے کے عمل کی جزا قطعاً کسی کو نہ دی جائے گی۔

"کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے صلہ میں جو تم نے اپنے گذشتہ ایام میں کئے تھے۔"
(الحاقہ ۔ ۲۴)

یعنی آخرت میں انسان کو جو نعمتیں ملیں گی وہ بھی انسان کے اپنے ہی اعمال کے بدلے ملیں گی، کسی دوسرے کے اعمال کے عوض ہرگز نہیں۔

"تاکہ ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ مل جائے۔" (طٰہٰ ۔ ۱۵)

یعنی ہر نفس کو اس کی سعی کی جزا ضرور ملے گی۔ غور کیجئے اور سوچئے کہ یہ ایصالِ ثواب، فاتحہ خوانی اور دیگر اس قسم کے اُمور کس کی سعی ہیں؟ مرنے والے کی یا اس کے لواحقین کی؟ ظاہر ہے کہ اس میں مُردے کی سعی کو ذرہ برابر دخل نہیں۔ اس لئے جس کی سعی ہے اس کے کھاتہ میں اسے ڈالا جائے گا۔ اب کچھ آیات تشریح کے بغیر بھی پیش کی جاتی ہیں:۔

- اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مکلّف نہیں بناتا مگر اسی کا جو اس کی طاقت اور اختیار میں ہو۔ اس کو ثواب بھی اسی کا ملے گا جو ارادہ سے کرے اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے۔

(البقرہ ۔ ۲۸۶)

- آج تم کو تمہارے کیے کا بدلہ ملے گا۔ (الجاثیہ — ۲۸)
- تم کو بس انہی کاموں کا بدلہ ملے گا جو تم کیا کرتے تھے۔ (یٰسین — ۵۴)
- یہ تیرے ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے۔ (الحج — ۱۰)
- تم کو ان ہی عملوں کی جزا دی جا رہی ہے جو تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے۔ (النمل — ۹۰)
- یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سے سمیٹے ہیں۔ (العمران — ۱۸۲)
- پھر ہمارے پاس تم کو آنا ہے پھر ہم سب تمہارا کیا ہوا تم کو جتلا دیں گے۔ (یونس — ۲۳)
- اور تم سے تمہارے اعمال کی ضرور باز پرس ہو گی۔ (النحل — ۹۳)
- آپ کا رب ان کو ان کے اعمال (کی جزا) کا پورا پورا حصہ دے گا۔ (ہود — ۱۱۱)
- اور ان سے کہا جاوے گا کہ یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنا دیئے گئے اپنے اعمال کے عوض میں۔ (الزخرف — ۷۲)

ان تمام آیات پر غور کیجئے، تو ہر جگہ انسان کے اپنے عمل کا ذکر ہو رہا ہے، دوسروں کے انجام دئے ہوئے عمل کا کوئی ذکر نہیں اگر ہم اس قسم کی تمام آیات پیش کریں، تو وہ سینکڑوں سے متجاوز ہوں گی، لیکن سارے قرآن میں کوئی شخص ایک لفظ بھی ایسا نہیں دکھا سکتا جس میں کسی ایک انسان کے عمل کو کسی دوسرے سے منسوب کیا گیا ہو یا ان پر اجر کا کوئی سرسری سا تذکرہ بھی کیا گیا ہو۔

ضیاء اللہ

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔

اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (۲/۱۶۹)

"بے شک (قوانین خداوندی سے سرکشی برتنے والے) تمہیں (لوگوں کو) یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ بے جانے بوجھے معاشرہ میں ناہمواریاں اور برائیاں پھیلاؤ اور خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرو جن کا تمہیں علم نہ ہو۔"

اس آیۂ مبارکہ کے علاوہ بھی قرآنِ مجید کی متعدد آیات میں اس امر پر تنبیہہ کی گئی ہے کہ ہر بات کو بے جانے بوجھے ذاتِ باری تعالیٰ سے منسوب کر دیا جائے۔ مگر صد حیف کہ ہماری ناعاقبت اندیشی کے سبب معاشرے میں قرآن سے بے اعتنائی کچھ اس طرح رواج پا گئی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو بلا تحقیق قرآن کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے۔ کچھ اسی پر اکتفا نہیں بلکہ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ جب کسی کی توجہ اس امر پر مبذول کروائی جائے تو وہ بڑی دیدہ دلیری اور ڈھٹائی سے اپنے موقف پر زیادہ شدت سے جم جاتا ہے اور کچھ یوں گویا ہوتا ہے۔ "چلو کوئی بات نہیں قرآن میں نہیں تو حدیث یا فقہ میں یہ بات آئی ہوگی، آخر ایک ہی بات ہے!"

زیرِ نظر مضمون گذشتہ چند برس میں پیش آنے والے ان تجربات و مشاہدات کا آئینہ دار ہے جو قرآنِ مجید سے متذکرہ بالا بے اعتنائی پر مبنی رویے کی عکاسی کرتے ہیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ قرآنِ مجید سے تغافل کے یہ واقعات ناخواندہ یا نیم تعلیم یافتہ طبقے سے وابستہ نہیں بلکہ ان کا تعلق اس طبقے سے ہے جسے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کہا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہمارے ہاں کے بعض دانشور بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔

میری ایک عزیزہ جو ایم اے معاشیات کی طالبہ ہیں، ایک مرتبہ فرمانے لگیں کہ قرآنِ مجید میں آیا ہے کہ جب

بچہ سات سال کا ہو جائے تو اُسے نماز کے لئے کہو اور جب دس سال کا ہو کر بھی نماز نہ پڑھے تو اُسے ڈنڈے سے نماز پڑھاؤ۔ مجھے ان کی اس لاعلمی پر خاصی حیرت ہوئی اور میں نے ان کو سمجھایا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے ہم کسی ایسی بات کو اس کی طرف منسوب نہیں کر سکتے جو اس میں نہیں ہے لیکن وہ بگڑ کر بولیں کہ ہماری میڈم نے کہا ہے۔ جب میں نے انہیں یقین دلایا کہ اس قسم کی یا اس نوعیت کی کوئی بھی آیت قرآنِ مجید میں کہیں نہیں ہے تو اس پر وہ بولیں "اچھا تو کوئی بات نہیں حدیث تو ہوگی"۔ "اچھا تو کوئی بات نہیں" پر تو بعد میں بات ہوگی، پہلے چند واقعات اور آپ کے گوش گزار کر دوں۔

آج ہی ایک صاحب جو میڈیکل کالج میں میرے ہم جماعت ہیں فرمانے لگے کہ قرآنِ مجید میں آیا ہے کہ ساڑھے سات تولے پر اتنی زکوٰۃ واجب ہے۔ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ جناب اس مفہوم کی تو کوئی بھی آیت قرآنِ مجید میں نہیں ہے، تو وہ بھی یوں گویا ہوئے "تو پھر کیا ہوا، حدیث ہوگی آخر ایک ہی بات ہے"۔

اب سے کچھ دن پیشتر ٹیلی ویژن پر ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء کو نشر ہونے والے "نیلام گھر" میں اس سٹیج شو کے میزبان جناب طارق عزیز صاحب فرمانے لگے کہ قرآنِ مجید میں آیا ہے الکاسب حبیب اللہ۔ حالانکہ آپ پورا قرآنِ مجید شروع سے آخر تک دیکھ جائیے آپ کو یہ آیت کہیں بھی نہیں ملے گی۔ عین اسی روز کالج سے واپسی پر میرے ایک ہم جماعت دوست نے اسی نام نہاد آیت کا حوالہ دیا کہ قرآن میں یوں آیا ہے۔ اس پر میں سٹپٹا اُٹھا اور ان سے درخواست کی کہ ازراہِ کرم قرآن کے ضمن میں احتیاط برتا کیجئے۔ اس پر ان کا جواب بھی وہی تھا کہ "چلو کوئی بات نہیں، حدیث تو ہوگی، ایک ہی بات ہے"۔ اسی دن رات کو جب ٹیلی ویژن پر جناب طارق عزیز نے بھی الکاسب حبیب اللہ کو قرآنِ مجید سے منسوب کیا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میں نے ایک عدد خط جناب طارق عزیز صاحب کے نام لکھ تو دیا تھا، خدا معلوم وہ کیا جواب دیتے ہیں۔ کہیں وہ بھی یہی نہ کہہ دیں "اچھا تو کوئی بات نہیں، حدیث ہوگی، آخر ایک ہی بات ہے نا!"

بوالعجبی کا ایک اور واقعہ بھی ٹیلی ویژن پر ہی پیش آیا۔ سندھ کے ممتاز دانشور ڈاکٹر تنویر علی عباسی صاحب "وحدت الوجود اور صوفی ازم" پر ایک لیکچر دے رہے تھے۔ اسی خطبے کے دوران آپ نے ارشاد فرمایا کہ قرآنِ مجید میں آیا ہے خَلَقَ اللّٰهُ النَّاسَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر تخلیق کیا۔ میری سمجھ میں تو یہ بات قطعاً نہیں آتی کہ وہ کون سا قرآن ہے جس میں سے یہ لوگ بڑی ہی ڈھٹائی سے ایسی آیات نکال کر لے آتے ہیں جن کا کتاب اللہ میں سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔

کچھ عرصے سے ٹیلی ویژن پر اذان کے بعد ایک روایتی دعا پڑھی جاتی ہے اور قرآن کا ہر قاری اس امر سے بخوبی آگاہ ہوگا کہ یہ قرآن کی آیات نہیں ہیں۔ لیکن میرے ایک عزیز جو انجینئر ہیں انہوں نے مجھ سے استفسار کیا

کہ یہ دُعا قرآن کی کس سورت میں ہے؟ جب میں نے ان کی اس لاعلمی پر انہیں بتایا کہ یہ قرآنِ مجید میں نہیں ہے تو پہلے تو وہ اصرار کرتے رہے کہ ہو نہ ہو یہ قرآنِ مجید کی آیات ہیں جبھی تو ذرائع ابلاغ اِسے اتنی اہمیت دیتے ہیں۔ میں نے صرف اتنا عرض کیا کہ حضرت اہمیت تو وہ "درود شریف" کو بھی دیتے ہیں حالانکہ قرآنِ مجید میں اس قسم کا کوئی "درود شریف" نہیں ہے۔ بلکہ "درود" کا لفظ بھی فارسی سے مستعار لیا گیا ہے ورنہ قرآنِ مجید میں اِس کا وجود نہیں اور عربی زبان بھی اس لفظ سے ناآشنا ہے۔ اِس پر حضرت فرمانے لگے "اچھا تو کوئی بات نہیں، حدیث ہوگی، آخر ایک ہی بات ہے۔"

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ق ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ط (۲/۷۹)

پس بربادی ہے ان لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھ سے کتاب لکھتے ہیں (یعنی شریعت کے احکام اپنی مرضی کے مطابق وضع کر لیتے ہیں) پھر کہتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کے ارشادات ہیں۔ (اور یہ اس لئے کرتے ہیں) تاکہ اس طرح کچھ فائدہ حاصل کر سکیں۔

جب اِن حضرات سے کہا جاتا ہے کہ جناب کم از کم قرآن کے بارے میں تو احتیاط برتیئے تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے پر تل جاتا ہے کہ پھر کیا ہوا، قرآن میں نہ سہی حدیث میں تو یہ بات آئی ہوگی، آخر ایک ہی بات ہے نا۔" اب ان عقل کے اندھوں سے کون اُلجھے کہ حضرت کچھ ہوش کے ناخن لیجئے۔ اللہ تعالیٰ کے کلام اور رسولِ اکرمؐ کی طرف منسوب کردہ کلام میں کچھ تو امتیاز روا رکھئے لیکن مجال ہے جو ان احباب کے سر پر جوں تک رینگتی ہو، "وہی مرغ کی ایک ٹانگ" اور "وہی ڈھاک کے تین پات۔" اگر ان سے کچھ جواب بن نہ پڑے تو پھر جھٹ سے یہ آیت نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیں گے۔ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی۔ ایک صاحب سے جب متذکرہ بالا مسائل پر بات ہو رہی تھی تو انہوں نے بھی یہی آیت مجھے سُنا دی اور کہا کہ پھر کیا ہوا آخر حدیث بھی تو کلام الٰہی کا پرتو ہے۔ جو کچھ حدیث میں ہے وہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے فرمایا ہے۔ پھر میں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کروائی کہ زیرِ بحث آیت میں ھُوَ کی ضمیر کا اشارہ کس کی طرف ہے، قرآن کی طرف یا رسولِ اکرمؐ کے فرمان کی طرف؟ اس پر وہ صاحب سوچ میں مستغرق ہو گئے۔ شاید وہ اپنے ماضی کے اُن تمام اسباق کا جائزہ لے رہے تھے جو انہوں نے اپنے والدین، اپنے اساتذہ اور روایتی ملاؤں سے حاصل کئے تھے۔ میں نے جب اس آیت کا ترجمہ کچھ اس طرح ان کی خدمت میں پیش کیا۔

"اور نہیں بولتے آپ اپنی خواہش پر مگر وہ (قرآنِ مجید) ہے کلامِ الٰہی جو آپ کی طرف وحی کیا جاتا ہے۔"

لیکن برس ہا برس کی سوچ چند ثانیوں میں تو تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔ لاکھ سمجھایا کہ ھُوَ کا اشارہ قرآنِ مجید کی طرف ہے لیکن وہ اسی بات پر مُصر رہے کہ حضورؐ کے کلام اور اللہ کے کلام میں کوئی فرق نہیں۔

اور تو اور کچھ ایسے مقولے زبانِ زدِ عام ہیں کہ عوام الناس اُن کا استعمال بے سوچے سمجھے کرنے لگتے ہیں۔ ایک صاحب موسیقی کی تعریف میں رطب اللسان تھے اور زمین و آسمان کے قلابے ملاتے چلے جا رہے تھے۔ آخر کار اسلام پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ دلیل کیا دی کہ:

"وہ آیا نہیں جی کہ "موسیقی رُوح کی غذا ہے"۔"

ہمیں اس سے تو کچھ غرض نہیں کہ موسیقی واقعی رُوح کی غذا ہے یا نہیں، ہمیں تو اس نسبت پر اعتراض ہے جو یہ افراد ان باتوں کو اسلام اور قرآن سے ملانے پر تُل جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق نہیں تو اور کیا ہے؟

SUBSCRIPTION FOR TOLU-E-ISLAM CAN ALSO BE PAID TO

IN KUWAIT	Mr. Ubedur Rahman Arain, P.O. BOX 22412 Safat 13085.
IN CANADA	Mr. A.R. Qureshi, P.O. Box 2303 Station C Downsview ONT M3N 2V8.
IN LONDON	Mr. M.M. Farhat, 76 Park Road Illford, ESSEX IGI ISF.
IN YARDLEY	Raja Muhammad Younas, 633 Church Road Yardley Birmingham B33 8HA.
IN YORKSHIRE	Mr. M. Afzal, 4 Richmond Mount, Leeds LS6 IDG, West Yorkshire.
IN NORWAY	Malik Khadim Hussain, Elgtrakket 711277 OSLO 12.
IN DENMARK	Mr. M.A. Khilji, Gammel Kongevej 47 3.th 1610 Copenhagen V.
IN SAUDI ARABIA	Mr. Asif Jalil PO Box 693, Riyadh 11421
IN USA	Mr. Saeed Iqbal 6704 19th Avn. Brooklyn NY 11204.

ثریا عندلیب

اقبالؒ اور اصولِ اجتہاد

اسلام میں اصولِ اجتہاد کا جو مقام ہے اس کی وضاحت حکیم الامت علامہ اقبالؒ علیہ الرحمۃ کے مشہورِ زمانہ خطبات تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کے چھٹے خطبے میں مکمل طور پر ملتی ہے۔ آج اس عظیم مفکر اور دانائے راز کی یاد تازہ کرتے ہوئے اس خطبہ کے چند اقتباسات قارئین کے استفادے کے لئے پیش کرتی ہوں۔ اقبالؒ لکھتے ہیں۔

"اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے۔ لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلق کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر (جیسے متضاد عناصر) میں تطابق و توافق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرہ میں تغیر کا امکان ہی نہیں ـــــ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی علوم میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ لہٰذا دیکھنے کی چیز یہ

ہے کہ اسلام کی وضع اور ترکیب میں کونسا اصولِ حرکت کارفرما ہے۔ یہ وہی اصول ہے جسے اجتہاد کہتے ہیں۔"

اس کے بعد اقبالؒ نے اس خطبہ میں مسئلہ اجتہاد پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اجتہادِ مطلق کو اسلام کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔ یعنی قانونی حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی کا کلی اختیار۔ اقبالؒ اس اجتہاد کے متعلق آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"سنی حضرات نظری طور پر تو اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کا اجتہاد ممکن ہے۔ لیکن ائمہ فقہ کے مذاہب کے قیام کے بعد عملاً اس کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجتہاد کے لئے جن شرائط کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا پورا کرنا کسی ایک فرد کے لئے قریب قریب ناممکن ہے۔ ایک ایسے نظامِ شریعت میں جس کی بنیاد قرآن پر ہو۔ جو زندگی کے متعلق حرکیاتی اور ارتقائی تصور کا علمبردار ہے۔ اس قسم کی ذہنیت کچھ عجیب سی دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا آگے بڑھنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان اسباب و علل کا انکشاف کریں جن کی وجہ سے یہ ذہنیت پیدا ہوئی۔ جس نے قانونِ شریعت کو یکسر جامد بنا کر رکھ دیا۔"

علامہ اقبالؒ نے اپنے اس خطبے میں تفصیلی طور پر جن اسباب و علل کو اس جمود و تعطل کا ذمہ دار گردانا ہے۔ ان میں سے چند اہم نکات کی طرف قارئین کی توجہ دلانا چاہتی ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے۔

"آیئے اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلہ میں دیئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رُو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے۔ اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی سے ہمارے قدیم فقہاء نے قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ انہی فقہاء کی بالغ نظری کا رہینِ منت تھا چنانچہ فان کریمر اس ضمن میں لکھتا ہے کہ "رومیوں کو چھوڑ کر دنیا میں سوائے عربوں کے اور کوئی قوم ایسی نہیں جس کے پاس اس قدر احتیاط سے مرتب کردہ قانونی نظام ہو" لیکن

اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا درست نہیں۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب (اربعہ) اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں۔ لیکن نظری طور پر اجتہادِ مطلق کے امکان سے انہیں بھی کبھی انکار نہیں ہوا۔ میں نے ان اسباب و علل سے بحث کی ہے جو علماء کی اس ذہنیت کا موجب بنے۔ لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوونما ارتقا سے وجود میں آگئی ہیں۔ اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو برقرار رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہب فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرا سمجھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربے کی روشنی میں فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقا ہے۔ اس کا مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمائے سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔"

اقبالؒ اس قسم کی ماضی پرستی کو تاریخ کا جھوٹا احترام قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔" جیسا کہ دورِ حاضر کے ایک مصنف نے لکھا ہے۔ "تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں۔ ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔" اقبالؒ لکھتے ہیں "تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی جھوٹی تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔ اسلام میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دینا اسلام کے خلاف افترا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں میں قانون کے تصور نے ایک خاص معین شکل اختیار کر لی اور دوسری وجہ یہ کہ قوموں کے زوال کے زمانے میں ذہنوں میں اس قدر جمود اور تساہل پیدا ہو جاتا ہے کہ بڑے بڑے

مفکّرین کو (انسان سمجھنے کی بجائے) معبود بنا دیا جاتا ہے۔ اگر علمائے متاخرین میں سے بھی بعض نے اس 'افترا' کو برقرار رکھا ہے تو وہ ان کا اپنا فعل ہے۔ دورِ حاضر کا مسلمان اس کا پابند نہیں کہ جس طرح انہوں نے برضا و رغبت اپنی فکری آزادی کو (اپنے خود ساختہ معبودوں کی) نذر کر دیا تھا۔ یہ بھی اپنی آزادی کو سلب ہو جانے دیں۔ علّامہ سرخسی (دسویں صدی میں) لکھتے ہیں "اگر اس افترا کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ پہلے زمانے کے مفکّرین و مصنّفین کو زیادہ سہولتیں حاصل تھیں اور ان کے مقابلہ میں متاخرین کے راستہ میں بہت سی دشواریاں ہیں تو ایسا سمجھنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے کہ اس معمولی سی بات کے سمجھنے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں کہ متقدمین کے مقابلہ میں متاخرین کے لئے اجتہاد زیادہ آسان ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اب قرآن اور سنّت کی اس قدر تفسیریں اور شرحیں لکھی جا چکی ہیں کہ ہمارے زمانے کے مجتہد کے پاس تعبیرات کے لئے کافی سے زیادہ مسالہ موجود ہے (جو متقدمین کے پاس نہیں تھا)"

اربابِ علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ یہ نظریہ کہ کسی ایک دَور کے قوانین ہمیشہ کے لئے غیر متبدّل ہیں، سب سے پہلے امام شافعیؒ نے پیش کیا تھا۔ لیکن امامِ اعظم نے اس کی مخالفت کی۔ علّامہ اقبالؒ نے ان کی اس بحث پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ

"امام شافعیؒ نے اپنے آپ کو صرف ان نظائر کے دائرہ میں محدود کر لیا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صحابہؓ میں وقوع میں آئے تھے۔ اس سے دیکھنے کا دائرہ بہت تنگ ہو گیا۔ انہوں نے بات تو یہاں سے شروع کی تھی کہ اہمیت ٹھوس واقعات کو حاصل ہے لیکن انہوں نے ایک خاص دَور کے ٹھوس واقعات کو ابدی اور غیر متبدّل سمجھ لیا اور خاص واقعات کے متعلق احکام کو اس قسم کے ملتے جلتے واقعات پر منطبق کرنے کے لئے قیاس سے شاذ و نادر کام لیا۔ ان کے برعکس ان کی سخت تنقیدیں مذہبِ حنفیہ کے لئے (ایک اور رنگ میں) بڑی مفید ثابت ہوئیں۔ اس سے انہوں نے محسوس کر لیا کہ اصولِ قانون سازی کی تعمیر میں زندگی کی حقیقی (واقعاتی) نقل و حرکت اور تنوع کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کا مکتبِ فقہ جس نے ان مباحث کے نتائج کو اچھی طرح جذب کر لیا تھا اپنے خاص الخاص اصولِ فقہ میں بالکل آزاد ہے اور دیگر مذاہبِ فقہ اور تشریع کے مقابلہ میں حالات سے مطابقت کی بڑی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے۔"

اس کے بعد اقبالؒ نے اپنے خطبہ میں لکھا ہے۔

"لیکن جائے حیرت ہے کہ موجودہ حنفی علماء نے خود اپنے مکتبِ فقہ کی روح کے خلاف امام ابوحنیفہؒ اور ان کے رفقاء کے فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے رکھا ہے بعینہٖ اسی طرح جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ پر تنقید کرنے والوں نے ان فیصلوں کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے لیا تھا جو عہدِ رسالتمآبؐ اور صحابہؓ میں پیش آمدہ معاملات کے سلسلہ میں نافذ ہوئے تھے۔"

آگے چل کر اقبالؒ یوں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہیں۔

"مجھے اس میں ذرا سا بھی شُبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون کے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائیگی کہ اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطہ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجہِ ناراضگی ہو جائے گا۔ بایں ہمہ اس باب میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں گا۔"

اس سے بھی بہت پہلے اقبالؒ نے صوفی تبسّم کے نام ایک خط میں لکھا تھا۔

"ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص مؤخرالذکر) کے متعلق دیگر اقوام میں اس وقت تک مروّج ہیں ان پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں ـــــ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں ـــــ میں نے ایک بڑے

عالم کو یہ کہتے ہوئے سُنا کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کا نظیر ناممکن ہے، یہ وقت عملی کام کا ہے کہ اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت کبھی نہیں آیا۔"

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے جو اصولِ اجتہاد اور قانون سازی کے بارے میں جو ارشادات رقم فرمائے ہیں ان کا یہ ملخص ہمارے سامنے آتا ہے کہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول و اقدار مستقل اور غیر متبدّل ہیں جنہیں قرآن میں حدود اللہ کہا گیا ہے۔ ہر اسلامی حکومت اس کی مجاز ہوتی ہے کہ وہ ان حدود کے اندر رہ کر اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جزئی قوانین اور طریق کار خود متعیّن کرے۔ ایسا کرنے میں وہ سابقہ ادوار کے قوانین سے بطور نظائر استفادہ کر سکتی ہے لیکن وہ ان کی پابندی پر مجبور نہیں ہوتی۔ اس باب میں علامہ اقبالؒ نے شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کا بصیرت افروز قول لکھا ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

"پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریقِ کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذّات نہیں ہوتی اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔"

یہ وہ حقائق ہیں جنہیں اس مردِ مومن نے، جسے اقبالؒ کہتے ہیں ساٹھ ستر سال پہلے قوم کے سامنے پیش کیا۔ مگر کیا ہم آج بھی اسی مقام پر نہیں کھڑے جس سے آگے بڑھنے کا ہمیں راستہ دکھایا گیا؟ کیا ہم اور بھی پیچھے نہیں ہٹ گئے؟ اور بھی نیچے نہیں گر گئے؟ کیا ہم اب بھی اپنا احتساب نہیں کریں گے؟ اقبالؒ کو تو اس خیال نے اپنے آخری لمحات میں تڑپا دیا اور آبدیدہ کر دیا کہ میں نے تو مسلمانوں کو کامیابی کا راستہ دکھایا ہے لیکن اگر انہوں نے میرے مشورے پر عمل نہ کیا تو ان کا کیا حال ہوگا؟؟ آج ہمارا کیا حال ہے؟ ذرا سوچئے!!!

یہ کس کا پاکستان ہے؟

میں فورتھ کلاس میں پڑھتی ہوں۔ بہت پیارا سکول ہے۔ یونیفارم بھی بہت عمدہ ہے اور پڑھائی بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں اپنے ابّو کے ساتھ کار میں سکول جاتی ہوں۔ راستے میں کچھ بچّے ایسے بھی نظر آتے ہیں جو پیدل سکول جاتے ہیں۔ ان کی نہ کوئی یونیفارم ہوتی ہے نہ اُن کے بال بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی کا جُوتا ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اور کسی کا کوٹ پھٹا ہوا۔

میں نے ایک دن ابّو سے پوچھا — ابّو یہ بچّے کس سکول میں پڑھتے ہیں۔ ابّو نے کہا میں کسی دن دکھاؤں گا تمہیں وہ سکول اور پھر میں نے وہ سکول بھی دیکھا۔ ہائے اللہ! یہ سکول تھا؟ ایک طوفان برپا تھا۔ کچھ بچّے بھاگ دوڑ رہے تھے۔ کچھ آپس میں لڑ رہے تھے۔ اتنے میں ایک ٹیچر آیا اور اس نے کچھ پوچھے بغیر سب کی مرمّت کر ڈالی۔ مجھے ان بچّوں پر بڑا ترس آیا۔ میں نے ابّو سے پوچھا کہ یہ بچّے میرے جیسے اچھّے سکول میں کیوں داخل نہیں ہو جاتے۔ ابّو نے بتایا کہ یہ بچّے غریب ہیں اس لئے میرے سکول کی فیس ادا کرنا ان کے بس کی

بات نہیں ـــ یہ تو ٹھیک ہے مگر لوگ امیر اور غریب بن کیسے جاتے ہیں۔ بڑے آدمی تو مختلف ہو سکتے ہیں۔ کسی نے تعلیم حاصل کر لی۔ کسی نے فیکٹری لگا لی۔ کوئی زمین کا مالک بن گیا لیکن بچّے تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔

میں نے سُنا ہے اللہ سب بچّوں کو برابر پیدا کرتا ہے یہ بچّے کس طرح امیر غریب بن جاتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ؟ ایسا کون کرتا ہے ؟ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ پاکستان اللہ میاں نے سب مسلمانوں کو تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ اس میں کم از کم بچّوں کو تو ایک جیسا ہونا چاہیئے۔ سب کی ایک جیسی یونیفارم ہو۔ ایک جیسی پڑھائی ہو۔ ایک جیسے سکول اور ایک جیسے استاد ہوں۔ سب کے لئے کتابیں ہوں۔ سب کے لئے ایک جیسا کھیل کا سامان ہو۔ یہ ٹھیک ہے بڑوں کی بڑی باتیں ہم بچّوں کی سمجھ سے باہر ہیں لیکن اتنا تو میں بھی سمجھتی ہوں کہ بچّے بیچارے نہ امیر ہوتے ہیں نہ غریب اور پھر قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ نے یہ ملک چند بڑے آدمیوں کے لئے تو نہیں بنایا تھا۔ ہم ہر روز گاتے ہیں ـــ یہ میرا پاکستان ہے ، یہ تیرا پاکستان ہے ، یہ سب کا پاکستان ہے ـــ کیا ہم جھوٹ بولتے ہیں ؟ بتائیے ناں۔

آپ کی بیٹی

(راستی توصیف)

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت

علامہ غلام احمد پرویز

ایمان کسے کہتے ہیں

۳

ایک شخص کو تین دن سے کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ بھوک سے اس کا بُرا حال ہو رہا ہے۔ وہ بالکل نڈھال ہو رہا ہے۔ وہ اپنے ایک دوست کے ہاں جاتا ہے۔ جو اس کے لئے گرم گرم پلاؤ کی پلیٹ لاتا ہے۔ وہ اس کی طرف لپک کر بڑھتا ہے۔ جلدی سے لُقمہ اُٹھاتا ہے اور مُنہ کے قریب لے جاتا ہے کہ اتنے میں ایک لڑکا بھاگے بھاگے آتا ہے اور کہتا ہے کہ اس پلاؤ میں غلطی سے نمک کی جگہ سنکھیا پڑ گیا ہے۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ بھوکا اُس پلاؤ کو کھا لے گا؟ وہ اسے کبھی نہیں کھائے گا۔ وہ بھوک کی سخت تکلیف برداشت کرلے گا لیکن اس لُقمہ کو مُنہ میں نہیں ڈالے گا۔ وہ پلیٹ کو اُٹھا کر پھینک دے گا۔

اس نے اس قدر سخت بھوک کے باوجود اس پلاؤ کو کیوں نہیں کھایا۔ اس لئے کہ اُسے یقین ہے کہ اس کے کھانے سے وہ ہلاک ہو جائے گا۔ اسے ہزار لالچ دیجئے۔ وہ اُسے کبھی نہیں کھائے گا۔ اس پر کتنی ہی سختی کیجئے وہ کبھی لُقمہ مُنہ میں نہیں ڈالے گا۔

خُدا کے قوانین پر اس قسم کے پختہ یقین کو ایمان کہتے ہیں اور اس قسم کے ایمان رکھنے والے کو مومن کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس

قسم کا انسان (یعنی مومن) ان تمام نقصانات سے محفوظ رہے گا جو ان قوانین کی خلاف ورزی سے پہنچ سکتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ ایمان کا لازمی نتیجہ امن ہوتا ہے۔

لیکن مومن، اپنے آپ ہی کو ایسے نقصانات اور خطروں سے محفوظ نہیں رکھتا۔ وہ دوسروں کو بھی ان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے مومن کے معنی ہیں، وہ شخص جس کی زندگی کا مقصد یہ ہو کہ وہ دنیا میں امن قائم کرے۔

چونکہ خُدا کے قوانین کے مطابق چلنے سے، دنیا امن میں رہتی ہے اس لئے خدا کی ایک صفت اَلْمُؤْمِنُ (۵۹/۲۳) بھی ہے یعنی امن دینے والا۔

اس مثال میں یہ بھی دیکھئے کہ جس بھوکے نے زہر ملے ہوئے پلاؤ کو نہیں کھایا وہ اس کے نقصان سے تو محفوظ رہا ہے لیکن اس سے اس کی بھوک کا علاج نہیں ہوا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اُسے عمدہ کھانا ملے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے لئے اتنا ہی کافی نہیں کہ وہ خطروں سے محفوظ رہے۔ اس کے لئے اس سے کچھ زیادہ بھی ضروری ہے۔ یہ کیا ہے؟ اسے اگلے شمارہ میں دیکھئے۔

اس مضمون کا انگریزی ترجمہ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

Children Page

WHAT IS EIMAN (BELIEF) ?

Umar is hungry for the last three days and feels extremely weak. He goes to the house of a friend who offers him a plateful of warm delicious pudding. He voraciously steps towards it. But as soon as he brings a spoonful of it to his mouth, somebody rushes towards him and tells him that by mistake arsenic has been put into the pudding instead of sugar. Do you think the hungry man shall eat that pudding? No, he shall never eat it. He whall bear the pangs of hunger but shall never put the poisonous food into his mouth. He shall rather throw away the plate. Why has he not taken this food inspite of being extremely hungry? Because he has got the firm belief that he shall die after taking it. How much one might induce him to eat, he shall never do so. A firm belief like this in the laws initiated by God is called "Eiman"(Belief) It is apparent that such a man shall always remain safe from the injurious effects which arise from disobedience of the laws of Allah. That is why a firm belief in the laws of Allah results in " Aman" peace. A " Momin" not only saves himself from such injurious effects he also saves other people from it. He thus becomes an instrument of making peace in the world. A humanity remains safe and peaceful by obedience of the Divine laws, that is why one of the attributes of Allah is " Almoman" (Quran 59:23) which means one who provides peace.

It has been stated above that the man who did not take poisonous food saved himself from its poisonous effect. But that did not result in appeasing his appetite. For that he needed some other harmless and nutritious food. It indicates that human beings not only need protection from injury, they need something more than that. What is this need, shall be explained under the next heading.

علّامہ غُلام احمد پرویزؒ کا درسِ قرآنِ کریم

درج ذیل مقامات پر ہوتا ہے

شہر	مقام	دن	وقت
۱۔ ایبٹ آباد	۵۹۵ کے ایل کیہال	جمعۃ المبارک	۱۰ بجے صبح
۲۔ بوریوالہ	بر مکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی ۵	ہر ماہ پہلا تیسرا جمعہ	۹ بجے صبح
۳۔ پشاور	بر مکان محترم عبدالرزاق نزد چوک شہیداں قصہ خوانی بازار	بدھ / جمعہ	۴ بجے شام
۴۔ پشاور	بر مکان ابن امین فقیر آباد	جمعۃ المبارک	۴ بجے شام
۵۔ پیر محل	مکان نمبر ۱۴۰/ ۱۳۹، مدینہ پارک	ہر ماہ پہلا جمعہ	۹ بجے صبح
۶۔ پنج کسی	بر مطب حکیم احمد دین	جمعۃ المبارک	۳ بجے سہ پہر
۷۔ جہلم	بر مکان محترم قمر پرویز مجاہد آباد۔ جی۔ ٹی۔ روڈ	//	۶ بجے شام
۸۔ جلالپور جٹاں	یونائیٹڈ مسلم ہسپتال	جمعرات	۱۰ بجے صبح
۹۔ چنیوٹ	ڈیرہ میاں احسان الٰہی کونسلر بلدیہ پیر بھٹہ بازار	جُمعۃ المبارک	۳ بجے بعد نمازِ جمعہ
۱۰۔ چک ۲۱۵ ای بی	بر مکان چوہدری عبدالحمید	//	۸ بجے صبح
۱۱۔ حیدرآباد	گولڈن سینٹری۔ عثمان آباد	//	۵ بجے شام
۱۲۔ راولپنڈی	بر مکان ملک فضل کریم ۴۰ مکھا سنگھ سٹریٹ رابطہ چوہدری نثار احمد، فون ۷۴۷۵۲	//	۳:۳۰ بجے شام
۱۳۔ رجانہ	بر مکان چوہدری ایس۔ ایم صادق۔ مین بازار	ہر ماہ تیسرا جمعہ	۱۰ بجے
۱۴۔ سرگودھا	۶۰ اے سول لائنز۔ ریلوے روڈ	جمعۃ المبارک	۹ بجے صبح
۱۵۔ سید حسن	بر مکان محترم سید محمد حسین	//	۳ بجے سہ پہر
۱۶۔ فیصل آباد	۲۳ سی پیپلز کالونی (نزد تیزاب مل)	//	۳:۳۰ بجے سہ پہر

شہر	مقام	دن	وقت
	رابطہ: ڈاکٹر محمد حیات ملک۔ فون ۴۲۸۵۵		
فیصل آباد	کارخانہ نٹ سازی گلی ۱۲، محلہ فیض آباد رابطہ فون: ۲۲۸۵۴ مرزا محمد صدیق	سوموار	۴ بجے سہ پہر
۱۷۔ کوئٹہ	۱۶۶/ڈی، جائنٹ روڈ	جمعۃ المبارک	۴ بجے شام
۱۸۔ کراچی	سنو وائٹ کمرشل کمپلیکس (فرسٹ فلور) شاہراہ فیصل (نزد بلوچ کالونی سگنل) فون: ۵۷۲۲۵۱ - ۵۴۷۳۲۹	//	۹:۳۰ بجے صبح
//	مکان ۱۲۰۶۔ گلی ۱۰، اے بی - ۳۶، شریف کالونی، لانڈھی۔	اتوار	۸ بجے شب
۱۹۔ گوجرانوالہ	شوکت نرسری گل روڈ، سول لائنز	جمعۃ المبارک	بعد از نماز جمعہ
۲۰۔ گجرات	مرزا ہسپتال کچہری روڈ	جمعرات	۳ بجے سہ پہر
۲۱۔ لاہور	۲۵۔ بی گلبرگ ۲ (نزد مین مارکیٹ)	جمعۃ المبارک	۹:۳۰ بجے صبح
۲۲۔ لیہ	رحمانیہ میڈیکل سنٹر	//	بعد نماز مغرب
۲۳۔ ملتان	شاہ سنز بیرون پاک گیٹ	//	۹ بجے صبح
۲۴۔ اوسلو (ناروے)	TORG GATA 26-28, OSLO-1	ہر ماہ پہلا اتوار	۴ بجے شام
۲۵۔ برمنگھم (یوکے)	229 ALUM ROCK ROAD	اتوار	۳ بجے سہ پہر
۲۶۔ ٹورنٹو	716 THE WEST MALL ETOBICOCK ONT. (416)650-9187(416)626-6781	ہر ماہ پہلا اتوار	۱۱ بجے صبح
۲۷۔ ڈنمارک	GL KONGEVEJ 4T, 3TH DK 1610 KBH V	ہر ماہ آخری ہفتہ	۲ بجے سہ پہر
۲۸۔ لندن	76 PARK RD, ILFORD ESSEX TELE 081-553-1896	ہر ماہ پہلا اتوار	۲:۳۰ بجے سہ پہر

شہر	مقام	دن	وقت
۲۹۔ لاہور	۱۲۸۔ ایل ماڈل ٹاؤن ایکسٹینشن	ہر بدھ	بعد نمازِ عشاء
۳۰۔ جوہرہ آباد	برمکان حکیم فاروق شاہ، قاضی کالونی	ہر جمعہ	بعد نمازِ جمعہ
۳۱۔ ماموں کانجن	برمکان ڈاکٹر (ہومیو) محمد اقبال عامر چک ۵۰۹ گ ب	ہر جمعہ	بعد نمازِ جمعہ
۳۲۔ ڈی جی خان	مدینہ ٹائپنگ کالج بلاک ۲، کچہری روڈ	جمعہ	۳ بجے سہ پہر
۳۳۔ کویت	برمکان عبید الرحمٰن آرائیں صاحب فون ۵۳۱۶۲۷۳	جمعہ	۵ بجے شام
۳۴۔ یارڈے	۶۳۳ چرچ روڈ۔ رابطہ راجہ محمد یونس B 33 8 HA	آخری اتوار	۲ بجے دوپہر

مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں

بانیٔ پاکستان حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق ذاتی مشیر منفرد مفکرِ قرآن بانیٔ تحریکِ طلوعِ اسلام اور تحریکِ پاکستان گولڈ میڈلسٹ علامہ غلام احمد پرویزؒ کی

تصنیفات

مارچ ۱۹۹۲ء

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن - (مکمل سیٹ کھلے پارے)	۲۴۰/۰۰ روپے
پارہ نمبر ۱، ۳۰ (فی پارہ)	۹/۰۰ "
پارہ نمبر ۲ تا ۲۹ (فی پارہ)	۸/۰۰ "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ - مجلد)	۲۴۰/۰۰ "
(تین جلدوں میں - فی جلد)	۹۰/۰۰ "
لغات القرآن (مکمل سیٹ - مجلد - ایک جلد میں)	۳۸۵/۰۰ "
چار جلدوں میں - (فی جلد -/۱۰۰)	۴۰۰/۰۰ "
تبویب القرآن (تین جلدوں میں)	۳۵۰/۰۰ "
(ایک جلد میں)	۳۲۰/۰۰ "
مطالب الفرقان - سات جلدیں (مکمل)	۷۵۰/۰۰ "
جلد اول، سوم، پنجم اور ششم - (ہر جلد)	۱۰۰/۰۰ "
جلد دوم	۱۰۰/۰۰ "
جلد چہارم	۱۵۰/۰۰ "
جلد ہفتم - (اعلیٰ ایڈیشن)	۱۰۰/۰۰ "
" (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
من ویزداں (ڈیلکس)	۱۳۰/۰۰ "
(سٹوڈنٹس)	۶۰/۰۰ "
ابلیس و آدم	۱۰۰/۰۰ "
جوئے نور	۹۰/۰۰ "
برقِ طور	۹۰/۰۰ "

نام کتاب		قیمت
شعلۂ مستور		۹۰/۰۰ روپے
معراجِ انسانیت		۹۰/۰۰ "
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	(اعلیٰ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
"	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۲۵/۰۰ "
انسان نے کیا سوچا؟	(اعلیٰ ایڈیشن)	۱۴۰/۰۰ "
	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
اسلام کیا ہے؟		۷۵/- "
کتاب التقدیر		۹۰/۰۰ "
جہانِ فردا		۸۰/۰۰ "
شاہکارِ رسالتؐ	(ڈیلکس ایڈیشن)	۲۰۰/۰۰ "
"	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
نظامِ ربوبیت	(اعلیٰ ایڈیشن)	۱۲۰/۰۰ "
"	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۴۰/۰۰ "
تصوف کی حقیقت		۹۰/۰۰ "
قرآنی قوانین	(ڈیلکس ایڈیشن)	۵۰/۰۰ "
"	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۱۵/۰۰ "
سلیم کے نام خطوط	(مکمل سیٹ)	۱۳۰/۰۰ "
	(جلد اول -/۴۰ روپے، جلد دوم -/۴۰ روپے، جلد سوم -/۵۰ روپے)	
طاہرہ کے نام خطوط	(ڈیلکس ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
	(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۱۸/۰۰ "

نام کتاب	قیمت
ختم نبوت اور تحریکِ احمدیت	۶۰/۰۰ روپے
حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ	۲۰/۰۰ "
اقبالؒ اور قرآن۔ (جلد اول (ڈیلکس ایڈیشن)	۶۰/۰۰ "
جلد دوم (ڈیلکس ایڈیشن)	۱۰۰/۰۰ "

نام کتاب	قیمت
ISLAM - A CHALLENGE TO RELIGION	روپے
DELUXE EDN.	Rs. 100/=
STUDENT EDN..	Rs. 50/=
EXPOSITION of the HOLY QURAN VOL. I (UPTO SURA AL-KAHAF)	Rs. 200/=
اسلامی معاشرت (ڈیلکس)	۷۵/۰۰ "
(سٹوڈنٹس)	۲۵/۰۰ "

متفرق کتب

نام کتاب	قیمت
مقامِ حدیث	۲۰/۰۰ "
قرآنی فیصلے حصہ اول (سابقہ جلد اول، دوم، سوم)	۱۰۰/۰۰ "
جلد چہارم، پنجم (فی جلد)	۲۰/۰۰ "
تحریکِ پاکستان اور پرویزؒ (ڈیلکس ایڈیشن)	۲۵۰/۰۰ "
(سٹوڈنٹ ایڈیشن)	۷۰/۰۰ "
نوادرات: مجلد (H.B.)	۷۵/۰۰ "
پیپر بیک	۶۰/۰۰ "

نام کتاب	قیمت
اسبابِ زوالِ اُمت	۱۰/۰۰ "
قتلِ مرتد اور غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	۲۰/۰۰ "
ابلہ مسجد	۷۵/۰۰ "
	۶۰/۰۰ "
ISLAMIC WAY of LIVING (ENGLISH VERSION OF THE BOOK ISLAMI MUASHRAT by G.A. PARWEZ)	
DELUXE EDN.	Rs. 35/=
STUDENT EDN.	Rs. 20/=

طلوعِ اسلام سالانہ زرِ شرکت

اندرونِ ملک مبلغ ۱۲۰/۰ روپے
اور بیرونِ ملک مبلغ ۴۰۰/۰ روپے
یا ۱۸ امریکی ڈالر سالانہ ہے

لاہور کے علاوہ کسی بینک کا چیک بھجوانے کی صورت میں مبلغ ۲۰ روپے فی چیک کا اضافہ فرما لیا جائے۔

تصنیفات ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب

نام کتاب	قیمت
مظاہرِ فطرت اور قرآن	۱۳۲/۰۰ "
PHENOMENA of NATURE AND THE QURAN	Rs. 120/=

نام کتاب	قیمت
THE HEAVENS, THE EARTH & THE QURAN	Rs. 100/=
CONSPIRACIES AGAINST THE QURAN	Rs. 120/=
GATEWAY TO THE QURAN	Rs. 60/=
FOOD AND HYGIENE IN ISLAM	Rs. 10/=
QURANOCRACY NOT DEMOCRACY	Rs. 50/=

کتابیں ملنے کے پتے { طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور (پاکستان) فون ۸۷۹۲۴۶ ❋ مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور پاکستان

WANTED TRANSLATORS

For undertaking translation into

ENGLISH, FRENCH,

ARABIC,

PUSHTO, BALUCHI etc.

of Urdu Works of

ALLAMA GHULAM AHMED PARWEZ,

including 2nd half of Mafhoom-ul-Quran.

We need experts who, apart from being at home in

URDU and ARABIC

have command over any one or more of the above languages.

Interested persons are requested to contact the undesigned with credentials for settlement of terms.

Executive Head
TOLU-E-ISLAM TRUST
25 B, GULBERG - II
LAHORE.

CORRIGENDUM
March 92 Issue - Page 65 - Line 24 - for " as to" please read "from".

رابطۂ باہمی

اموات (۱) کوئٹہ کے جناب عبدالغفور محسن کے والد اور ناروے کے جناب محمد سلیم طاہر کے دادا، ۲۷ فروری ۱۹۹۲ء کو رحلت فرما گئے۔ مرحوم اپنی ذات میں ایک ادارہ تھے، وہ جہاں گئے قرآن کے چراغ روشن کرتے گئے۔

(۲) موضع گودپور ضلع سیالکوٹ کے چوہدری محمد دین صاحب جو بقول باباجیؒ اپنی ذات میں اکیلے ہی بزم تھے۔ زندگی کی ۹۰ بہاریں دیکھ کر ۲۵ جنوری ۱۹۹۲ء کو وفات پا گئے۔

(۳) ادارہ طلوعِ اسلام کی مجلسِ عاملہ اور ٹرسٹ کے رکن محترم محمد عمر دراز صاحب کو اپنی ہمشیرہ کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔

(۴) شمعِ رسالت کے پروانے، جنگِ آزادی کے خاموش مجاہد، علامہ اقبالؒ اور اُن کے کلام کے شیدائی اور قرآنی فکر کی ایک فاضل شخصیت الحاج میاں محمد شفیع آف بستی دانشمنداں حال مقیم یو۔کے کے پچھلے دنوں رحلت فرما گئے۔ آپ کی وفات سے حلقہ طلوعِ اسلام یُوکے میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے دیر تک محسوس کیا جائے گا۔ ادارہ دُعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ھدیۂ تبریک

قارئین طلوعِ اسلام کو ادارہ کی انتظامیہ کی طرف سے عید یعنی جشنِ نزولِ قرآن مجید پر دلی ہدیۂ تبریک قبول فرمائیں۔

آپ آئے ــــ

یہ مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کا بصیرت افروز پیغام ہے جو آپ نے ۹ اپریل ۱۹۹۲ء، بروز جمعرات صبح ساڑھے ۹ بجے طلوعِ اسلام کنونشن کے پنڈال میں وڈیو پر سُن سکیں گے۔

کنونشن

جیسا کہ پہلے اعلان کیا جا چکا ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۹۹۲ء کو طلوعِ اسلام کنونشن کے کھُلے اجلاس میں دعوتِ عام ہے پیشگی اطلاع اور مبلغ ۵۰ روپے کی ادائیگی پر آپ کے لئے طعام اور فرشی رہائش کا انتظام کیا جا سکتا ہے البتہ ملکا بستر ساتھ لانا ہوگا۔

خان افضل آفریدی

ہم اور اسلام

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر
اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

سب کہتے ہیں، ہم مسلمان ہیں! وہ ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ جو شخص بھی کلمۂ طیبہ پڑھتا ہے وہ مسلمان ہے اور اس کو کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا، لیکن انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اب ہم وہ مسلمان بالکل نہیں رہے۔ جن کی سچائی، دیانت اور اخلاق حسنہ ضرب المثل تھے اور جن کی خوبیوں کو دیکھ کر اغیار عش عش کر اٹھتے تھے۔ اب تو ملتِ اسلامیہ کی حالتِ زار علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں کچھ یوں ہے۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

جو اسلامی معاشرہ حضور سرورِ کائنات نے قائم فرمایا تھا، اس کی بنیاد امتِ واحدہ پر تھی۔ اس میں مذہبی، یا سیاسی پارٹی بازی کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ وَلَا تَفَرَّقُوْا پر ایمان تھا، ایک بین الاقوامی بھائی چارہ تھا، سب ایک تھے اور نیک تھے۔ ایک خدا، ایک قرآن، ایک رسول، ایک مرکز اور ایک دین پر اٹل ایمان اور اس دین کی سربلندی کے لئے وہ سرفروشانِ اسلام ہر وقت سرگرمِ عمل رہتے تھے۔

کچھ عرصہ بعد حکومتِ اسلامیہ کی بنیادوں میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ پیغمبرِ خدا کا قائم کردہ مرکز سیاسی مصلحتوں کے تحت تبدیل ہونے لگا۔ مدینہ منورہ سے کوفہ، کوفہ سے دمشق، دمشق سے بغداد، بغداد سے قاہرہ اور قاہرہ سے انقرہ، جہاں برائے نام خلافت کی قبا بھی چاک کر دی۔ بقول اقبالؒ۔

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

اغیار نے بالآخر ہمارے مرکزِ ملت کو ختم کر ڈالا اور عرب قومیت کا بُت پھر سے کھڑا کیا۔ ترکوں کے خلاف عربوں کے دلوں میں کرنل لارنس نے نفرت کا وہ بیج بویا کہ پہلے وہ ترکوں سے الگ ہوئے اور پھر خود چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ گئے کہ اس طرح "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے" کا نعرہ خواب بن کر رہ گیا۔

نتیجہ یہ کہ آج عراقی، ایرانیوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں، تو افغانستانی آپس میں نبرد آزما۔ کوئی امریکہ سے مدد کا طلب گار ہے، تو کوئی روس سے۔ حال ہی میں عراق نے کسی غیر اسلامی قوت کی مکارانہ چال میں پھنس کویت کو تاخت و تاراج کیا۔ نتیجتاً خود بھی برباد ہوا اور اسلامی کاز (CAUSE) کو بھی دھچکا لگایا اور یوں صدیوں کے بعد اسلامی دنیا میں جو اٹھان اور بھائی چارہ کی فضا بن رہی تھی، پارہ پارہ ہو گئی۔

تفریق اور پارٹی بازی عذابِ الٰہی ہے۔ پاکستانی عوام بھی اس عذاب سے دوچار ہیں۔ یہاں بھی مذہبی اور سیاسی پارٹیاں اقتدار کے لئے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔ ان کی بلا سے۔

پاکستانی قوم کی بدقسمتی یہ ہوئی کہ اس کا اولو العزم قائد بہت جلد چل بسا۔ قائد نگاہوں سے اوجھل ہوا، کشتی کے پتوار طالع آزماؤں نے سنبھال لئے۔ ان میں اکثریت نوابوں اور جاگیرداروں کی تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جن کے آباواجداد نے خاندانِ مغلیہ کی کشتی کو ڈبونے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ یہ پہلے بھی پانچ ہزاریئے اور دس ہزاریئے تھے اور غلامی کے دور میں بھی نواب اور جاگیردار رہے۔ اب پاکستان میں وہ اپنے سابقہ ادوار کا منصب کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ چنانچہ منظر پر آتے ہی انگریزوں کی پروردہ بیوروکریسی سے مل بھگت کر لی اور اسی پرانی نوابی اور جاگیردارانہ ٹھاٹھ سے غریب اور پسماندہ عوام پر بلا شرکتِ غیرے حکومت کرنے لگے۔ یہ قوم فروش افراد ہرگز نہیں چاہتے کہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو۔ وہ تو محض الیکشن جیتنے کے لئے اسلام کا نام لیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر اسلام کا نظام اصلی آب و تاب کے ساتھ نافذ ہو گیا، تو ان گندم نما، جو فروش رہنماؤں کو یا تو اپنا قبلہ درست کرنا ہو گا یا پھر راہِ فرار۔

ملک کی اقتصادی حالت کی بدحالی اور بیرونی قرضوں کے بوجھ کی تمام تر ذمہ داری بھی انہی خود غرض اور عیاش حکمرانوں کے بھاری کندھوں پر پڑتی ہے کیونکہ یہ لوگ سرکاری املاک کو اس قدر بیدردی سے استعمال کرتے ہیں جسے دیکھ کر وہ انگریز جو کبھی یہاں حکمران تھے، انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اس حکمران ٹولے کے پاس اتنی بہتات میں موٹر کاریں ہیں جتنی کہ شاید ان ملکوں کے حاکموں کے پاس نہیں ہوں گی جو خود موٹر کاریں تیار کرتے ہیں۔

رشوت ستانی کا یہ عالم ہے کہ بڑے سے بڑا اہل کار جب کہیں تبدیل ہو کر جاتا ہے، تو چارج لینے سے پہلے وہ چارج دہندہ سے کھلم کھلا دریافت کرتا ہے کہ یہاں پر مالِ غنیمت کے ذرائع کیا ہیں! ایسے ہی افسر شاہی عملہ اور شعبدہ باز سیاسی لیڈروں کے پاس دولت کی ریل پیل دیکھ کر کافی لوگ منشیات کے سمگلر بنتے جا رہے ہیں اور راتوں رات امیر کبیر بن رہے ہیں۔ اب تو نوبت بایں رسید کہ کئی وزراء اور بڑے بڑے افسرانِ اعلیٰ اور ان کے عزیز

اقارب بھی اپنی عزت و وقار کو داؤ پر لگا کر ہیروئن کے کاروبار میں ملوث ہو چکے ہیں۔ اس غلیظ دھندے میں بعض کبھی کبھار پکڑے بھی جاتے ہیں۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ پاکستانی قوم دولت کی دوڑ میں دیوانہ ہوا جا رہی ہے، ہر کوئی ہیرا پھیری میں لگا ہوا ہے، حلال اور حرام کی تمیز مٹ چکی ہے اور جن کے پاس کوئی معقول ذریعہ معاش نہیں، انہوں نے تخریب کاری شروع کر رکھی ہے۔ باقیماندہ (۸۰) اسی فیصد عوام جو اپنی غریبی میں شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، بھوک اور افلاس کا شکار ہیں اور بے شمار ایسے بھی ہیں جن کے پاس سر چھپانے کے لئے چھپر تک نہیں۔ یہ ہمارے سیاسی اور دینی رہبران محترم کے وہ کارنامے ہیں جو پاکستان کی ۴۴ سالہ تاریخ کا کامیاب بن چکے ہیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ ان ڈرائینگ روم میں بیٹھنے والے سیاستدانوں سے پیچھا چھڑائیں۔ مجمع جمانے والوں اور دھواں دار تقریریں کرنے والوں سے منہ پھیر لیں، نت نئے اتحاد بنانے والوں سے واشگاف الفاظ میں کہہ دیں کہ ہمارا اعتماد تم پر سے اٹھ چکا ہے، اپنی شطرنجی بساطیں الٹ دو۔ آؤ اپنے عوام میں اس طرح گھل مل جائیں کہ کوئی تفریق باقی نہ رہے۔ انہیں ہم قدم بنا کر آگے بڑھو۔ آؤ کہ اپنے دلوں میں پاکستان کے قیام کے مقصد کو تازہ کریں اور متحد ہو کر لا الہ الا اللہ کا راستہ اختیار کریں کہ اس وقت جن سنگین خطرات نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، ان سے بچ نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے۔

سبک رفتار قومیں مدتوں سے جادہ پیما ہیں
رہے گا ناشناسِ رم ہمارا کارواں کب تک

PRODUCED BELOW IS A COPY OF LETTER WRITTEN BY DR. SAYED ABDUL WADUD TO THE CHIEF JUSTICE OF FEDERAL SHARIAT COURT

Hon'ble Mr. Justice
Tanzeel-ur-Rehman
Chief Justice of the Shariat Court of Pakistan,
Islamabad.

Hon'ble Sir,

(1) Your valuable article in The daily 'Nawai Waqt' dated 15th Feb., re: late Justice Cornelius was indeed a true picture of the personality of the diseased. It reminded me of an incidence when nearly 18 years earlier one of his articles was published in The 'Pakistan Times daily'. He had raised a point in the said article about the subject of Meiosis which concerns the science of Biology. I wrote a letter pointing out to him that his viewpoint was not correct. It was a trifling matter and I thought the ex-highest law authority of the land shall not take notice of it. But to my surprise he sent me a reply coached in affectionate language telling me that my viewpoint was correct and said further, "I wonder how many other mistakes I have done in my article published in PT. This noble gesture inspired in my mind the highest reverence for the late Justice and I had been sending him my own publications off and on.

(2) **Hon'ble** Sir I hope you would not mind if I draw your kind attention to another issue —

I am a humble student of the Holy Quran and find, off and on, some serious mistakes in the law-making process in Pakistan based on the Quranic concepts. If I bring my point of view to the notice of some 'maulvi sahib', he without giving a serious attention to the matter simply gets annoyed. On the other hand if I bring it to the notice of an authority in the government circles such as a minister or an MNA, he does not show the least interest in the matter and thinks it to be a mere waste of time to indulge in it. If I give it in a journal or a newspaper, people just have a cursory look at it and that too only a few of them.

Yet to my mind the issues are important, hence I dare to bring it to the notice of the highest authority of the land giving decisions on law-making based on the Quranic concepts. The issues are so many yet I attach herewith one such issue which refers to four eye-witness in a case of 'zina'. I hope your goodself shall take notice of it. I beg to be excused for this interference.

Thanking you, Sir

Dr. Sayed Abdul Wadud
50-Usman Block, Garden Town,
Lahore.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مملکت پاکستان میں قانون سازی کا عمل بالخصوص قرآنی قوانین کا نفاذ انتشار کی زد میں ہے' مثال کے طور پر زنا کے مقدمات میں "چار ایسے گواہوں کی شہادت کا مسئلہ جنہوں نے زنا کے عمل کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو" اکثر زیر بحث آتا ہے۔ سیکولر ذہن رکھنے والے لوگ جو قرآنی قوانین کے نفاذ کے مخالف ہیں اکثر یہ کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ ایسے قوانین نافذ کرنے کا فائدہ ہی کیا جن پر عمل ممکن نہ ہو۔ یہ طعن درحقیقت قوانین نافذ کرنے والوں کی بجائے براہ راست خود قرآنی قوانین پر پڑتی ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کے متعلق پیچیدگی اور انتشار کو جو کہ ملائی ذہن کی پیداوار ہے دور کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم کے احکام اور قوانین بالکل واضح ہیں لیکن بعض مسائل مثلاً" زنا کے متعلق قرآنی آیات کی غلط تشریح نے پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے پہلے حدود آرڈیننس کے الفاظ کو سامنے رکھیے جو کہ حسب ذیل ہیں:۔

PROOF OF ZINA OR ZINA-bil-JABAR LIABLE TO HADD-

This shall be in the following forms:-

(a) The accused makes before a court of competent jurisdiction a confession of the commission of offence.

OR

(b). at least 4 Muslim adults make witnesses, about whom the court is satisfied having regard to the requirements of TAZKIYAH-al-SHAHUD, that they are truthful persons and abstain from major sins 'KABAIR', give evidence as eye witnesses of the act of penetration necessary for the offence, provided that if the accused is a non-Muslim, the eye witnesses may be non-Muslims.

(PAKISTAN TIMES, Feb., 12th 1979)

"زنا یا زنا بالجبر جس پر حد لگائی جا سکے اس کی مندرجہ ذیل شکلیں ہو نگی:۔

(ا) ملزم ایک بااختیار عدالت کے سامنے اپنے جرم کا اقرار کرے یا (ب) کم از کم چار ایسے گواہ جو بالغ مرد ہوں اور جن کے متعلق عدالت مطمئن ہو کہ وہ تزکیتہ الشہود کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور جو سچے لوگ ہوں اور کبیرہ گناہوں سے بچے ہوئے ہوں' شہادت دیں کہ انہوں نے دخول کے عمل کو جو کہ جرم کے لئے ضروری ہے' اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو' البتہ اگر ملزم غیر مسلم ہو تو چشم دید گواہ بھی غیر مسلم ہو سکتے ہیں۔"

اس ضمن میں پہلی قابل غور بات یہ ہے کہ ایسے معاشرہ ہیں جہاں افراد اکثر قرآن کی تعلیم سے قطعاً" بے بہرہ ہوں اور جہاں پر گواہ الا ماشاء اللہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر اقرار کرلے کہ جو کہونگا ایمان سے سچ کہونگا اور اس کے بعد بے دریغ جھوٹ بولتا چلا جائے' ایسے گواہ کہاں سے ملیں گے جن پر سو فی صد اعتبار کیا جاسکے۔ بہرحال یہ ایک ثانوی چیز ہے۔ میں اب اس چیز کی طرف آتا ہوں جو بے حد اہمیت رکھتی ہے اور وہ یہ ہے کہ زنا کا عمل ایک ایسی چیز ہے جس کا ارتکاب کبھی کھلے بندوں نہیں ہوتا بلکہ یوں کہیے کہ یہ ایک ناممکن بات ہے کہ زنا کے عمل کو دیکھنے والے چار شخص بیک وقت موجود ہوں۔ یہ تو یورپ اور امریکہ میں بھی ممکن نہیں جہاں بن بیاہے جوڑے اکٹھے رہتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سے یہ قانون پاکستان میں نافذ ہوا ہے اس وقت سے لے کر آج تک کتنے مقدمات سامنے آئے ہیں جن میں زنا کے عمل کے چار چشم دید گواہ پیش ہوئے ہیں یا یوں کہیے کہ نزول قرآن کے وقت سے لے کر اب تک کتنی ایسی مثالیں سامنے آئی ہیں۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ اس عرصہ میں کوئی زنا سرزد نہیں ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی قانون سازی قرآن سے بے خبری کی دلیل ہے۔ قرآن نے جس آیت میں چار چشم دید گواہوں کی شرط رکھی ہے وہ فواحش (مبادیات زنا) کے متعلق ہے زنا سے متعلق نہیں۔ چنانچہ کہا گیا۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾

"مسلمانو! تمہاری عورتوں میں سے جو بے حیائی کی حرکت کر بیٹھیں (جو زنا کی طرف لے جانے کی موجب ہو سکتی ہے) تو ان کے خلاف اپنے میں سے چار گواہ لاؤ اور اگر وہ شہادت دیں (اور جرم ثابت ہو جائے) تو ان عورتوں کو گھروں میں رکھو یہاں تک کہ موت ان کا کام تمام کر دے' یا ان کے لئے اللہ اور صورت پیدا کر دے جس سے وہ اس قسم کی حرکات سے باز آجائیں۔ (مثلاً" اگر وہ غیرشادی شدہ ہے تو اس کی شادی ہو جائے)۔

دوسری طرف زنا کے متعلق جو آیت ہے وہ یہ ہے۔

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْیَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَآئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۲﴾

"زانی عورت اور زانی مرد ان دونوں کو سو سو کوڑوں کی سزا دو (یہ قانون کا معاملہ ہے) اس لئے اس میں کسی قسم کی

نرمی نہ برتو' اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو (یعنی اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہو کہ یہ احکام خداوندی ہیں اور ان کے نتائج سامنے آکر رہیں گے خواہ اس دنیا میں ہوں یا اس کے بعد کی زندگی میں)۔ یہ سزا مؤمنین کے ایک گروہ کے سامنے نافذ کرو"۔

اب مندرجہ بالا دونوں آیات پر غور کیجئے

آیت نمبر(4:15) میں

(1) (فاحشہ) بے حیائی کی طرف اشارہ ہے ..... آیت نمبر(24:2) میں زنا کا ذکر کھل کر کیا گیا ہے

(2) صرف عورت کی بے حیائی کا ذکر ہے ..... عورت اور مرد دونوں کا ذکر ہے

(3) چار گواہوں کا ذکر ہے ..... چار گواہوں کا کوئی ذکر نہیں

(4) سزا عورت کو گھر میں بند کرنا ہے ..... سزا مرد اور عورت دونوں کے لئے ہے سو سو کوڑے حتیٰ کہ اس کی موت واقع ہوجائے۔

چنانچہ زنا اور فحش میں فرق کرنا لازم ہے۔ فحش مادہ (ف ح ش) کے معنی "حد سے بڑھ جانا' زیادتی کر بیٹھنا' ہے۔ قرآن کریم میں فحشا کا لفظ عدل کے مقابلہ میں بھی آیا ہے (16:90) اور قسط کے مقابلے میں بھی (7:28-29)۔ بخیل کو فاحش کہتے ہیں چنانچہ یہ لفظ فضل کے مقابلہ میں آیا ہے (2:268)۔ حضرت لوطؑ نے اپنی قوم سے کہا اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ (7 : 80) "تم ایسی بے حیائی کیوں کرتے ہو" پھر اس سے اگلی آیت (7:81) میں کہا گیا کہ اس بے حیائی سے مراد اغلام ہے (زنا نہیں)۔ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ النِّسَآءِ

مندرجہ بالا آیات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ فحش کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے' گو آیت (17:32) میں زنا کو بھی فاحشہ کہا گیا ہے۔

ولا تقربوا الزنی انت کان فاحشتہ و سات سبیلا ○

"اور زنا کے پاس مت جاؤ یہ بے حیائی اور بری راہ ہے"۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر جگہ جہاں فاحشہ کا لفظ آیا ہے اس کے معنی زنا ہے۔ چنانچہ آیت (4:15) جس میں چار گواہوں کا ذکر ہے وہ بھی زنا کے متعلق نہیں ہے۔ اب دیکھئے کہ آیات (4:15) اور (24:2) نے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے فواحش زنا کے ثبوت کو بھی اور انکی سزاؤں کو بھی واضح طور پر الگ الگ کر دیا گیا ہے۔

سورۃ انعام میں ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (6:52)

"فواحش کے قریب مت جاؤ جو ان میں سے ظاہر ہوں یا چھپی ہوئی ہوں"۔ چنانچہ لفظ فواحش بطور جمع خود اس

بات کی دلالت کرتا ہے کہ اس میں ہر قسم کی حدود شکنی آجاتی ہے۔ زنا کا ارتکاب اکثر فوری طور پر ظہور میں نہیں آتا۔ اس میں غیر مرد اور عورت پہلے آپس میں ملنے جلنے کے تعلقات پیدا کرتے ہیں' پھر آہستہ آہستہ ہم آغوشی تک نوبت آتی ہے اور آخر میں بات جنسی اختلاط تک پہنچتی ہے۔ قرآن کریم ان مبادیات سے روکنا چاہتا ہے تاکہ بات آگے نہ بڑھنے پائے۔ یہی وہ فواحش ہیں جن کا ذکر آیت (15- 4) میں ہے اور جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ کہ چارہ گواہ لاؤ۔ زنا کے عمل کے ثبوت کے لئے چارہ گواہ پیش کرنے کا حکم نہ قرآن نے دیا ہے اور نہ یہ عملی طور پر ممکن ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے مروجہ شہادتیں مثلاً" عورت کا میڈیکل ٹسٹ اور دیگر واقعاتی شہادتوں پر ہی انحصار کرنا پڑے گا۔

اب دیکھئے کہ جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسے قوانین کا فائدہ کیا جن پر عمل ممکن نہ ہو کس قدر غلط سوچ میں مبتلا ہیں۔ یہ واضح ہے کہ قرآن نے کسی ناممکن العمل شے کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔

عبدالودود

مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۹۲ء

Baba Guru Nanak journeyed to Mecca to perform the Hajj. A true Muslim according to him is:

" He who is firm in his faith

Has a right to be called Muslim.

His acts must accord with his faith in the Prophet.

He must clean his heart of pride and greed

No more troubled by the two impostors - Life and death.

Resigned to the will of God.

Knowing Him as the Doer.

Freed from the domination of the self,

compassionate to all things,

Such a one may call himself a Muslim."

(Var Majh P 88)

On his demise, the Hindus said that Nanak was a Hindu because he was born in a Hindu home. The Muslims claimed that he was a Muslim because he believed in the Islamic Creed. But with Guru Nanak a:-

"Religion consisteth not in a patched coat, or in a Yogi's staff, or in ashes smeared over the body;

Religion consisteth not in ear-rings, or shaven head, or in the blowing of horns and conches.

Abide pure amid the impurities of the world; thus

shalt thou find the way of religion.

(Rag Suhi M.1)

The Sikh Scripture includesthe *Adi Granth* and the *Dasam Granth*. In addition to the Granths, there are also the *Janam Sakhis* (traditional biographies of Guru Nanak).

Addressing a congregation of Muslims, he exhorted them as under:

" In the Mosque of love

Spread the carpet of faith,

Enjoy only your rightful earnings,

Follow the Holy Script.

Make restraint and modesty your circumcision.

Moderation your fast.

Right action your pilgrimage to Kaaba.

Make truth your spiritual guide.

Good work your creed,

Thus become a Muslim.

Repeat His name on your rosary,

He will exalt you."

(Var Majh P 140)

What better can even a Muslim, so lucidly and clearly explain the true teachings of Islam, as Baba Guru Nanak has done above !

Baba Guru Nanak recited often the Holy Quran and guided the people in the light of what he had read in the Holy Book. The holy gown which he used to wear on solemn occasions is still preserved in Dera Baba Nanak, a town in the Indian Province of (the East) Punjab. This holy gown is embroidered with the Islamic *Kalima-e-Tayyiba*:

"There is no god but God
and
Muhammad is his messenger."

On the right sleeve of the gown is written the following verse of the Holy Quran:

"VERILY THE RELIGION WITH GOD IS ISLAM"

BABA GURU NANAK AND HIS TEACHINGS.

This short and concise article is in response to the request made by a friend in Canada, to give a brief life sketch and basic teachings of the revered founder of the Sikh religion Baba Guru Nanak - a devoted servant of God and mankind.

(Muhammad Latif Chaudhery).

Baba Guru Nanak was born in a Hindu family on April 15, 1469 AD at Nankana Sahib, a town, about 75 kilometers away from the city of Lahore in Pakistan. At the age of 7, he learnt the alphabet and was then sent to a village Maulvi to learn Arabic and Persian. There he also studied the Quran and Islamic literature with Syed Hassan a devout soofi. Thereafter he remained in the service of one Nawab Daulat Khan for about 12 years. He left the service and travelled extensively throughout the Indo-Pak subcontinent right up to Assam in the East and down to Ceylon in the South. He also paid frequent visits to the Muslim mystics and saints of Pak-Pattan Pasrur, Panipat and Multan, in the province of Punjab before he decided to devote himself completely to the reformation of the people.

He disapproved the Hindu practices of Idolatry in all forms. and unlike his Hindus family, he believed in one God and denied all other gods, saying that one true God alone should be worshipped. In a word, he was a monotheist to the core of his heart and exhorted the people to follow the way of obedience and submission to one God alone as salvation lay in that way only. He refused to accept any compromise on the concept of the Unity of God and shunned the Hindu creed of multiplicity of gods and goddesses. He also disapproved the abominable caste system and abhorred the concept of untouchability and believed in the oneness of God and the whole humanity, practising equality between man and man. He opined that a man was to be respected not because he happened to belong to a particular caste, creed or decent but in fact he is to be honoured by the work he performs . (Parabhoti 4,10)

He glaringly differed with the tenets of the Hindu faith. He was more close to the true spirit of Islam being a staunch believer in the unity of God which is a cardinal principle of Islam.